1857ء
کے چند اہم کردار



ضیاء الدین لاہوری

نام کتاب	....	1857ء کے چند کردار
ترتیب و تحقیق	....	ضیاءالدین لاہوری
ناشر	....	گلفراز احمد
		علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	....	مئی 2007ء
قیمت	....	-/120 روپے

WWW.FAZLEHAQ.COM

علم و عرفان پبلشرز

34-اردو بازار، لاہور، فون: 7232336-7352332

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل: 0300-4125230

ترتیب

صفحہ	عنوانات

عرضِ احوال

''اٹھارہ سوستاون'' سرسری بیان کے لحاظ سے تو بڑا آسان اور جذباتی موضوع ہے مگر متعلقہ دستاویزات کی روشنی میں اس کی بعض جہتوں کا بیان بہت ہی مشکل، پیچیدہ اور چشم کشا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ میں خاص مصلحتوں کے تحت سچ کے ساتھ جھوٹ بھی ملا دیا گیا ہے۔ اگر ایک طرف ہمارے اہلِ قلم بعض ایسے کرداروں کو مثبت ظاہر کرتے ہیں جو اپنے اندر قطعی منفی سرگرمیوں کے پہلو سمیٹے ہوئے ہیں تو دوسری جانب ایک طبقہ اپنی مخصوص فکری وابستگی کی بنیاد پر جنگِ آزادی میں شامل بعض شخصیتوں کی کارگزاریوں کو برعکس بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل بعض کرداروں کے بیان میں متذکرہ صورتِ حال ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ان مضامین میں عبارت آرائی کی بجائے ہر بات کے ثبوت کے لئے تحقیقی طور پر اصل دستاویزات کے الفاظ اور مستند حوالوں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ دُعا ہے کہ جنگِ آزادی کے ڈیڑھ صد سالہ یادگار سال کے موقع پر اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت غلط بیانات کی حامل تحریروں کے اثرات کو دُور کرنے میں معاون ثابت ہو۔ آمین!

ضیاء الدین لاہوری

الحقائق۔ آصف بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
۲۰۰۷ء

جنگِ آزادی میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی شرکت

برِصغیر پاک و ہند میں بعض مرحوم شخصیات کی ملّی و سیاسی خدمات کے تذکروں میں ہمارے اہلِ قلم بہت ہی غلو برتتے ہیں۔ اگر کوئی شخصیت شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے منّ کو بھا جائے تو محض اس عقیدت کی بنا پر ہم اس کے رتبے کو بلند و بالا کرنے کے لئے بعض واقعات گھڑ لیتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ من گھڑت واقعات تاریخی حوالوں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی پس منظر کے تحت ہمارے دل میں کسی شخصیت سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کی تحقیر کی خاطر مستند حوالوں میں قطع و برید کر کے اس کے مثبت کاموں کو بھی منفی قرار دے ڈالتے ہیں، اور حقیقت میں اس سے اپنی دلی نفرت کے اظہار کے اس انداز سے اصل مقصود محض اپنے مخاصمانہ جذبات کی تسکین ہوتا ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی پر ۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی میں شرکت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا جس میں انہیں کالے پانی کی سزا دی گئی اور وہ جزائر انڈیمان میں آخر دم تک اسیر رہے۔ ہمارے اہلِ قلم کا ایک مخصوص طبقہ اس جدوجہد میں ان کے حصہ لینے سے انکاری ہے اور ان کے مدّاحوں کے بیان کردہ بعض واقعات کو افسانے قرار دیتا ہے۔ مدّاحوں کا بیان ہے کہ انہوں نے دہلی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جبکہ ان کے مخالف یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ایسے کسی فتوے پر اُن کے دستخط موجود نہیں۔ وہ ان کی عدم شرکت کے ثبوت میں ان کے بعض بیانات کو سیاق و سباق کے بغیر جزوی طور پر پیش کرتے ہیں یا پھر اس قسم کے

شبہات پیدا کئے جاتے ہیں جیسے کہ ان کی شرکت گویا مفادات کے تابع تھی۔

پروفیسر افضل حق قرشی مؤخرالذکر فریق کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ان کے عزیز ترین دوست سعید الرحمن علوی مرحوم کی مرتب کردہ ایک کتاب ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور جہادِ آزادی'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں آٹھ مضامین اور دو ضمیمے شامل تھے۔ ان میں پروفیسر موصوف کا ایک مقالہ بھی تھا۔ فاضل مرتّب نے اپنے دیباچے میں خاص طور پر ان کی تعریف کی تھی۔ علوی صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۹۲ء میں انہوں نے اس کتاب میں سے چار مضامین، جن میں اپنے مضمون کا تقریباً ایک خمس، جو ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں مولانا کی عدم شرکت کے بیان تک محدود تھا، منتخب کئے اور اس مجموعے کو نیا نام ''مولانا فضل حق خیرآبادی...... ایک تحقیقاتی مطالعہ'' دے کر اپنے نام سے شائع کرنے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ ذیل میں ان کے مضمون کے حوالے سے چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

مولانا فضل حق کا سب سے بڑا جرم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے بعض شیدائیوں نے، غلط یا صحیح، جہادِ آزادی کے حق میں جاری کئے گئے ایک فتوے میں ان کے شامل ہونے کا ذکر کیا اور چونکہ ایسا کرنے والے اپنے مؤقف کی حمایت میں کوئی دستاویزی ثبوت بہم نہ پہنچا سکے، اس لئے اُن کا ممدوح معتوب ٹھہرا اور اُس کا ہر کام اس کے مدّاحین کی متذکرہ نااہلیت کے باعث منفی قرار پایا۔ اس مکتبۂ فکر کے حامل اہلِ قلم ہروقت اس دُھن میں مگن رہتے ہیں کہ مولانا کی خوبیوں پر پردہ ڈالا جائے اور اختلافی امور اس طرح بیان کئے جائیں کہ ان کی قومی خدمات شکوک کی زد میں آکر معکوس انداز میں پیش ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو مولانا کی زندگی کی علمی سرگرمیوں کے بعض پہلو پسند نہیں جس کا اظہار وہ متذکرہ صورت میں کرتے رہتے ہیں۔ نادم سیتاپوری اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''انگریز اور اُن کے ہواخواہ تو مولانا سے اس لئے ناراض تھے کہ انقلابِ سن ستاون کے سلسلے میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آگیا لیکن مسلمانوں کا ایک پروپیگنڈسٹ گروپ مولانا سے اس لئے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحث کوئی

ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیر آبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا، لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔'' [۱]

یہ بات یقیناً درست ہے کہ جب تک ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف فتووں میں مولانا کے دستخط موجود ہونے کا ثبوت بہم نہ پہنچایا جائے، اس وقت تک ان کو فتویٰ کنندوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی انصاف نہیں کہ محض اس بنا پر ان کی جنگِ آزادی میں شرکت سے انکار کر دیا جائے۔ جہاں تک دستیاب فتووں میں ان کا نام موجود نہ ہونے کا تعلق ہے، یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ ہندوستان کے ہزار ہا علما، جن کے دستخط ان فتووں پر نہیں، کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کے ہاں معتوب ہوں گے؟ کیا اس بنیاد پر جنگِ آزادی میں ان کی سرگرمیاں اور قربانیاں ملعون ٹھہریں گی؟ کیا یہ لوگ ان علما سے بدتر ہیں جنہوں نے فتووں پر واقعی دستخط کئے مگر بعد میں مکر گئے یا اپنی بریت کے لئے متعدد بہانے تراشے؟ یہی اہلِ قلم خود اس دور کے اُن بے شمار علما کے قصیدے بیان کرتے ہیں جو فتویٰ کنندگان میں شامل نہیں۔ معلوم ہوا کہ موجود فتووں پر کسی عالم کے دستخط موجود ہونا ضروری طور پر اس کے حُریت پسند ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ان پر اس کا نام نہ پایا جانا کوئی جرم ہے۔ جنگِ آزادی میں اس کے مجموعی طرزِ عمل ہی سے اس کے کردار کی جانچ کی جا سکتی ہے۔ اُس دور میں علما کی ایک تعداد نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے حق میں فتوے دئے جس سے عام مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو تقویت حاصل ہوئی، بالکل درست! ہاں، اگر ایسے کسی فتوے پر کسی عالم کا دستخط کرنے سے انکار کر دینے کا کوئی قابلِ قبول ثبوت ملتا ہے تو پھر اس امر پر بحث کی گنجائش موجود ہے مگر یہاں صرف مولانا فضل حق کے دستخطوں کی عدم دستیابی کے مسئلے نے ایک علمی جنگ کا ماحول پیدا کر رکھا ہے اور اس کی تائید اور تردید میں مقالوں پر مقالے لکھے گئے ہیں حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان لوگوں کے کرتوت اجاگر کئے جاتے جو اندر سے کچھ اور تھے اور باہر سے کچھ اور۔ ان کا حدود اربعہ متعین کرنے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی گئی۔

پروفیسر قریشی مولانا کے خلاف سب سے پہلی شہادت سید مبارک شاہ کوتوال کی دیتے ہیں کہ ''فضل حق نے جہاد کے حق میں کوئی فتویٰ نہیں دیا یا کسی بھی طریقہ سے بادشاہ کو

گمراہ نہیں کیا"۔ [۲] موصوف نے اپنے مقصد کا حوالہ تو ڈھونڈ لیا مگر شاید ان کو علم نہیں کہ وہی کوتوال مفتی صدر الدین کے بارے میں بھی یہ کہتا ہے کہ:

"شہر کے صدر الصدور مفتی صدر الدین کو شہزادوں اور فوج دونوں نے بار بار اس امر کا فتویٰ جاری کرنے کو کہا کہ وہ جس جہاد میں مصروف ہیں، وہ جائز اور درست ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ مفتی صاحب نے ایسا کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ دراصل ایسا کوئی فتویٰ ممکن ہی نہیں کیونکہ قرآن اور مذہب اسلام میں اس قسم کے اعلان کا وجود کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔" [۳]

جبکہ موصوف کی اسی کتاب کے ایک مضمون میں شامل ایک فتوے کے دستخط کنندگان میں مفتی صاحب کا نام موجود ہے۔ امتیاز علی عرشی کے اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر اطہر عباس کی ہندی کتاب "سوتنتر دہلی" کے آخر میں "بہت سے اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیے گئے ہیں۔ ان کے منجملہ صادق الاخبار دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحے پر فتویٰ جہاد بھی موجود ہے۔" [۴] "اخبار الظفر" دہلی کے حوالے سے اس کے استفتا اور جواب کی جو عبارتیں مضمون میں نقل کی گئی ہیں، ان کے مطابق فتویٰ کنندگان میں نمبر ۳ پر مفتی صدر الدین کا نام ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ [۵] واضح ہوا کہ اس ضمن میں کوتوال کا "فرمان" قابلِ اعتبار نہیں، اور خاص کر اس صورت میں کہ وہ جہاد کے فلسفے پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ یہاں یہ کیفیت بھی سامنے آتی ہے کہ محققین نے اس دور میں جاری ہونے والے ایک سے زائد فتووں کا ذکر کیا ہے۔ کیا کوئی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اُس دور میں جتنے فتوے جاری ہوئے، ان سب کا ریکارڈ محفوظ ہے؟ سوچنے کا مقام ہے کہ اگر کل کلاں کوئی ایسا فتویٰ دستیاب ہو جائے جس میں مولانا کے دستخط موجود ہوں تو اِن "محققین" کی مبینہ تحقیق کی کیفیت کیا ہو گی؟ حیران کُن امر یہ ہے کہ اہلِ قلم کے اِس قبیلے کے ممتاز فرد غلام رسول مہر فتوے کی تیاری اور مشورے میں مولانا کا ذکر کرتے ہیں مگر جنگِ آزادی میں ان کی شرکت سے انکاری ہیں۔ فرماتے ہیں:

"......میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا

تھا اور اُن ہی نے علما کے نام تجویز کیئے جن سے دستخط لئے گئے۔ غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجامِ کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا، ورنہ انہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا تھا، نہ اُن کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ اُن کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔" [6]

پروفیسر قریشی بھی مولانا کی شرکت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "مولانا جنگِ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، وہ دہلی خصوصاً باغیوں سے ملنے نہیں گئے تھے"۔ [7] اس کے بعد انہوں نے مولانا ہی کے درجِ ذیل الفاظ سے اپنا مطلب اختراع کرنے کی کوشش کی ہے:

"اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل وعیال موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح، کامیابی، کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا، اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے میرا مشورہ قبول نہ کیا اور نہ میری بات مانی"۔ [8]

موصوف نے مولانا کی "رائے اور مشورہ" کو منفی ظاہر کرنے کے لئے منشی جیون لال کی ڈائری سے درجِ ذیل اقتباس دے کر بقول ان کے یہ "عقدہ" کھولا ہے کہ مولانا جنگ کے حامی نہیں تھے:

"مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا، شہر کو مسمار کر دیا جائے گا اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اس کے بعد مولوی نے کہا کہ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔" [9]

مضمون نگار موصوف کے پیش رو غلام رسول مہر درجِ بالا الفاظ کو مولانا کی گفتگو تسلیم

نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ ''مجھے یقین ہے کہ یہاں اردو روزنامچے کے انگریزی مترجم سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ یہ رائے کسی اور کی ہوگی جو مولانا سے منسوب کردی گئی'' [۱۰] مگر ہمارے مضمون نگار کی تو ساری تحقیق کی بنیاد ہی مولانا کا یہ مشورہ ہے۔ ہم اس حوالے کی عبارت کو مولانا کی گفتگو قرار دینے سے انکار نہیں کرتے لیکن دیکھنا ہوگا کہ اس مشورے کا پس منظر کیا تھا اور بادشاہ نے ان کی باتوں کا کیا جواب دیا؟ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جیون لال کے بیان سے درج بالا حوالے کے بعد کی عبارت ''لا تقربوا الصلوٰۃ'' کی مثال کی مانند حذف کردی گئی کیونکہ اس سے ہی صحیح صورتِ حال کی وضاحت ہوتی تھی اور من پسند نتائج حاصل کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ افسوس ہے کہ اس نامکمل حوالے سے متاثر ہوکر بعض دیانت دار محقق بھی اُنہی کی رو میں بہہ گئے اور اس جدوجہد میں مولانا کی شرکت کو منفی انداز میں قبول کیا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل جیون لال کے بیان کا باقی حصہ بھی ملاحظہ کرلیا جائے۔ وہ متذکرہ بالا بیان کے بعد لکھتا ہے:

> ''بادشاہ نے جواب دیا کہ اپنی افواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔ مولوی نے جواباً کہا کہ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی اُن کا کہنا نہیں مانتے جو اُن کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ ''اچھا، تو اپنی فوج کو محاصل جمع کرنے کے کام پر لگادو''۔ [۱۱]

اس تمام گفتگو سے معلوم ہوا کہ مولانا بادشاہ کو وقت کے اہم ترین مسئلے کا احساس دلا رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر اسے حل نہ کیا گیا تو فتح ناممکن ہے اور شہر کے باشندے خواہ مخواہ قتلِ عام کی زد میں آئیں گے۔ اس وقت شہر میں مالی بدنظمی کا جو عالم تھا، جیون لال کے روزنامچے کی لحہ بہ لحہ داستان میں اس کی بڑی تفصیل موجود ہے۔ سپاہیوں کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لئے خوراک موجود نہ تھی اور نہ اپنے خاندان کی کفالت کے لئے کوئی رقم۔ وہ آئے دن بادشاہ سے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ بادشاہ ان کا مطالبہ کیسے پورا کرتا جبکہ اس کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا۔ وہ تو خود انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور ان حالات میں اسے وہ رقم ملنی بھی بند ہو چکی تھی لہٰذا سپاہی روزمرّہ ضروریات پورا کرنے کے لئے شہر میں لوٹ مار کرتے تھے اور

مالدار افراد سے بزورِ بازو روپیہ وصول کیا جاتا تھا جس کی پکار دربار میں بھی ہوتی تھی۔ متذکرہ بالا گفتگو ۱۸/ اگست کو ہوئی۔ صرف اس وقت تک کے بے شمار واقعات میں سے چند ایک کا ہلکا سا خاکہ پیشِ خدمت ہے:

☆ "(۱۴ مئی) دیسی افسروں نے پھر فوجوں کے راشن کے لئے مطالبہ کیا اور کہا کہ فوجوں کو لوٹ مار سے نہیں روکا جا سکتا۔" [۱۲]

☆ "(۱۵ مئی) خبر ملی کہ باغی شہر کے باشندوں سے بہ جبر روپیہ وصول کر رہے ہیں۔" [۱۳]

☆ "(۲۱ مئی) آج قلعہ سپاہیوں سے بھر گیا جو اپنی تنخواہ کے لئے چلا رہے تھے۔" [۱۴]

☆ "(۲ جولائی) جنرل نے منادی کرادی کہ...... جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے گا، اس کے ہتھیار اس سے چھین لئے جائیں گے۔" [۱۵]

☆ "(۷/ اگست) سفر مینا کے ایک صوبیدار نے...... متنبہ کیا کہ اگر فوج کو فی الفور تنخواہ نہ دی گئی تو وہ شہر میں لوٹ مار شروع کردے گی۔" [۱۶]

☆ "(۱۷/ اگست) نصیر آباد کے توپچیوں نے بغیر تنخواہ کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" [۱۷]

ان حالات میں سپاہیوں کی ایک بھاری تعداد مجبوراً روز بروز اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھی۔ صرف تین رپورٹیں ملاحظہ فرمائیں:

☆ "(۳۱ مئی) ...... تقریباً ایک ہزار سپاہی اپنی وردیاں پھینک کر فقیروں کے بھیس میں اپنے اپنے گھر چل دئے ہیں۔" [۱۸]

☆ "(۱۵/ اگست) آج تین سو سپاہی تنخواہ کے ملنے سے مایوس ہو کر اور بغاوت کے نتائج سے دل برداشتہ ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ہتھیار اور بندوقیں پیش کر دیں اور کلکتہ دروازہ سے گزر کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔" [۱۹]

☆ ''(۱۶/اگست) کل تقریباً دوسو سپاہیوں نے فقیروں کا بھیس بدل کر بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر یہ لوگ پل پر پکڑے گئے اور انہیں واپس لایا گیا۔ بادشاہ سلامت نے بذاتِ خود اُن کے بیان لئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک تو اُن کے پاس کوئی رقم نہیں، دوسرے ان کے گھر تباہ ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا۔ ان سے ہتھیار لے لئے گئے اور انہیں گھروں کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔'' [۲۰]

غور کا مقام ہے کہ کیا ان حالات میں انگریزوں پر فتح کی کوئی امید کی جا سکتی تھی؟ مولانا کی جو نامکمل گفتگو فاضل مضمون نگار نے پیش کی، وہ اِسی پس منظر کے تحت تھی اور وہ بادشاہ کو اس صورتِ حال کے متوقع نتائج سے آگاہ کر کے اسے بالواسطہ طور پر یہ احساس دلا رہے تھے کہ سپاہیوں کی تنخواہوں کے لئے کچھ کیا جائے تا کہ وہ خوراک وغیرہ کے مسائل سے نجات پا کر دل جمعی کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہوں اور انگریزوں پر غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ویسے بھی جب اس جدوجہد کے سلسلے میں جہاد کا فتویٰ دینے کے اقدام کی تحسین کی جائے گی تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہوگا کہ یہ کیفیت دینی حیثیت کی حامل ہے، اور دین میں جہاد کے لئے سب سے بڑی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ مقابل پر فتح کا قیاس غالب ہو۔ بہر حال مولانا اور بادشاہ کی اس گفتگو کا جو ردِ عمل ہوا، اس کی وضاحت مکند لال کی اسی روز یعنی ۱۸/اگست کی رپورٹ سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''جب بادشاہ دربار کرنے کے بعد اپنے کمرۂ خاص میں تشریف لے گئے تو مولوی فضل الحق، نواب احمد علی خاں بہادر، بُدھا صاحب اور مرزا خیر سلطان بہادر نے تحریری احکام دئے جو مفصلہ ذیل ہیں:......'' [۲۱]

ان میں نمبر ۱۶، نمبر ۱۷، نمبر ۱۸ و نمبر ۲۶ کے تحت مولانا کے حوالے سے چار احکام کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

''بنام حسن بخش عرض بیگی، ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مولوی فضل الحق کی موجودگی میں لکھا گیا......''

''بنام فیض محمد، اسے ضلع بلند شہر و علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ حسبِ ہدایت مولوی فضل الحق تحریر کیا گیا۔''

''بنام ولی داد خاں، مذکورہ دونوں آدمیوں کی آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے تحریر کیا گیا۔ مولوی فضل الحق'' ....

''بنام مولوی عبدالحق خاں، ضلع گوڑگانوہ کی مالگزاری آمدنی وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔ حسبِ ہدایت مولوی فضل الحق لکھا گیا جن کا بھتیجا گوڑگانوہ جائے گا۔'' [۲۲]

معلوم ہوا کہ بادشاہ سے مولانا کی جو گفتگو ہوئی، اس کے مطابق انہوں نے محصول اکٹھا کرنے کا کام شروع کر دیا اور اس میں شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سب کچھ ان سپاہیوں کی تنخواہوں کا انتظام کرنے کے لئے کیا گیا جو انگریزوں سے لڑ رہے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشتیں درج والا واقعہ کو یوں بیان کرتی ہیں:

''دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا: ''اب وقت کا تقاضا ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے تاکہ انہیں کچھ سہارا ہو''۔ بادشاہ نے کہا: ''رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا، تو وہ پہنچی تھی مگر نا کافی تھی اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویّہ ہے''۔ مولوی صاحب نے کہا: ''حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دُور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجئے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کرنے دیجئے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے''۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''آپ تو یہیں ہیں، آپ انتظام سنبھالئے''۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: ''میرے بھتیجے اور دوسروں کو گوڑگانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانۂ تقرر جاری کیا جائے، وہ سب انتظام کرلیں گے اور الور،

جھجر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی پروانے جاری کیجئے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا''......مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے، بادشاہ کومشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اوراُن کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں، فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو صرف خاندانِ تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست ونابود ہو جائیں گے۔'' ۲۳

پروفیسر قریشی نے مولانا فضل حق کی دہلی میں آمد کے بیان میں ان کے الفاظ ''فلاح، کامیابی، کشائش وشادمانی کی امید'' کوعبداللطیف کے ۱۸۵۷ء کے روزنامچے کی مندرجہ ذیل عبارت کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے:

''جب زمانہ میں شوروشر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے۔ نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا۔ وہ حصولِ عہدہ کے خواہش مند تھے۔'' ۲۴

یہ ایک ڈائری نویس کا اپنا تجزیہ ہے کہ وہ کسی کی نیت کو اپنے الفاظ میں کس طرح بیان کرتا ہے۔ اگر مولانا کو''حصولِ عہدہ'' کی واقعی خواہش تھی تو بھی اس کا ایک پس منظر ہے۔ آپ حکومت کی کسی شعبے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال چاہتے ہیں تو آپ کے پاس کوئی عہدہ ہونا چاہیے۔ نظم ونسق کے اصولوں کے تحت اس کے بغیر کوئی آپ کے احکام ماننے یا آپ کی حکمتِ عملی اختیار کرنے کا پابند نہیں ہوسکتا۔ مولانا کو تختۂ مشق بنانے میں اہلِ قلم کا جو طبقہ پیش پیش ہے، اس کے فلسفے کے مطابق تو مسلمہ مجاہدین کو بھی ہوس پرست ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ اگر اس کیفیت کو دیانت کا معیار ٹھہرا لیا جائے تو جنگِ آزادی کے سب سے بڑے جرنیل بخت خاں کی درجِ ذیل آرزوئیں کس کھاتے میں شمار کی جائیں گی؟:

''(۲ جولائی) بادشاہ نے جنرل (بخت خاں) کو نج میں باریابی دی۔ جنرل نے کہا کہ میں بھی آپ ہی کے خانوادہ سے ہوں اور بادشاہ سے کہا کہ اپنا

اطمینان کرنے کی غرض سے آپ تحقیقات فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ اس وقت جنرل سے اور کوئی بڑا آدمی موجود نہیں ہے۔ جنرل نے جواب میں عرض کیا کہ میں بہادر کے خطاب کا حقدار ہو جاؤں گا اگر میں دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔'' [۲۵]

''(۱۱ جولائی) ...... بخت خاں نے (بادشاہ سے) اثنائے گفتگو میں ظاہر کیا کہ میں ضلع لکھنؤ کے موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور شاہِ اودھ کے خاندان سے ہوں۔ اور عرض کیا گیا کہ اگر آپ کو میرے بیان میں کچھ شبہ ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ مجھے آپ کی شرافت ونجابت پر پورا یقین ہے۔ جنرل نے جواب دیا کہ میں تصدیق پر اس غرض سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریز دہلی، میرٹھ، آگرہ سے نکال دئے جائیں گے تو میں حُسنِ خدمات کے معاوضہ کا طالب ہوں گا۔'' [۲۶]

''(۲۶ جولائی) جنرل محمد بخت خاں کی درخواست پر انہیں گورنر کے درجہ پر فائز کیا گیا۔ بادشاہ نے جنرل کے طرزِ عمل پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ جنرل نے بھی اپنی عزت افزائی پر شکریہ ادا کیا اور دس اشرفیاں بطورِ نذر پیش کیں اور وعدہ کیا کہ میں جواں بخت کی ولی عہدی کی تائید کروں گا۔'' [۲۷]

جنگِ آزادی میں مولانا فضل حق کی شرکت انگریزوں کے جاسوس تراب علی کی رپورٹوں کے الفاظ میں یوں واضح ہوتی ہے:

''(۲۴۔۲۵ راگست) الور کے مولوی فضل حق پچھلے ہفتے سے یہاں ہیں اور انگریزی حکومت کی شدت سے مخالفت اور دوسری ترکیبوں سے کونسل کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُن کالڑکا سہارن پور کا ناظم مقرر ہوا ہے۔'' [۲۸]

''(۲۸ راگست) مولوی فضل حق جب سے دہلی سے آیا ہے، شہریوں اور

فوج کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔ آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا، شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا ......مولوی فضل حق کے کہنے پر شہزادے اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً سبزی منڈی کے پُل پر لڑتے ہیں۔'' [۲۹]

''(۳۰ ؍اگست) ......اگر آپ مرزا الٰہی بخش کو اس کے خط کا جواب دے دیں تو اس مقصد کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا اور مولوی فضل حق اور دوسرے باغیوں کو شہر سے باہر نکال دے گا۔'' [۳۰]

''(یکم ستمبر) (جنگی مشاورتی) کونسل میں دہلی کی ہر رجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی اور مولوی فضل حق بھی شامل ہیں۔'' [۳۱]

باقی رہی بات مولانا پر مقدمے کی مثل کی جس کے کچھ حصے فاضل مضمون نگار کی کتاب میں شامل مالک رام کے مضمون میں بیان کئے گئے ہیں، ان میں نقل فیصلہ کے تحت مولانا کے متعلق درجِ ذیل عبارت قابلِ غور ہے:

''عدالت کی نظر میں یہ ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلا ضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور اُن کے من مانے معنی کئے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں؛ اور اس لئے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ اگر تم انہیں قتل نہیں کرتے تو خود خدا کی نظر میں مجرم ہو۔'' ......

''یہ بات بھی قطعی شہادتوں سے ثابت ہوگئی ہے کہ ملزم سردار ممو خاں کا خاص معتمد علیہ تھا اور وہ اکثر ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا جیسا کہ اُس موقع پر

بھی ہوا جب اس نے قتل کا فتویٰ دیا۔''

''یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن ......اس نے بہیمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور اُن کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لئے انصاف اور امنِ عامہ کا یہ تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔''......

''بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ و دانستہ دہلی آیا اور اُس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔'' ۳۲؎

دستاویزات پیش کرنے کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ عدالتی فیصلے میں شہادتوں سے مولانا کے فتوے اور ''باغیوں سے رشتہ جوڑنے'' کے ثابت ہونے کے ذکر کے باوجود پروفیسر قریشی کی مانند حضرت مالک رام بھی اپنے مضمون میں یہ فرماتے ہیں کہ

''پورے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو......لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلک رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے؛ انہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار ہی اٹھائی۔'' ۳۳؎

مولانا کے مخالف اہلِ قلم اپنی تحقیق کے نتائج ان کے عدالتی بیان کی بنیاد پر نکالتے ہیں۔ دراصل مولانا اپنے اس بیان میں بغاوت میں ملوث ہونے سے انکاری ہیں جبکہ شواہد اُن کے بیان کی تردید کرتے ہیں۔ برِ صغیر کے انگریزی عدالتی نظام میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں جن میں بڑے بڑے نام ملتے ہیں۔ ہم بہادر شاہ کے مقدمے کی کارروائی پڑھتے ہیں تو وہاں بھی اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ بہادر شاہ کے بیان کے اُس حصے کی ایک ہلکی سی جھلک پیشِ خدمت ہے جس میں اس نے بغاوت کا سارا نزلہ باغی فوج

''میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آ پہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دِلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں دے دی تھیں، اس لئے ہم سب گرفتار ہوکر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ ''موت تمہارے سر پر ہے، گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں، وہ دریا میں کود پڑیں''۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے، اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا، اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر کر مر گئے۔'' ۳۷

اب مولوی محمد باقر پر کیا گزری، ملاحظہ فرمایئے:

''......انہوں نے اپنے انگریز دوست مسٹر ٹیلر کو، جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے اور زبردست عیسائی مبلغ تھے، باغیوں کے غیظ وغضب سے بچانے کے لئے پہلے اپنے گھر میں پناہ دی، پھر اُن کو بھیس بدل کر باہر بھجوادیا لیکن باغیوں کی فہرست مجرمین سے ان کا خارج ہونا ممکن نہیں تھا۔ ٹیلر نے باغیوں کے مزاج کا ادراک کرنے کے بجائے اپنے پناہ دینے والے محسن سے باغیوں کے عتاب کا بدلہ لیا۔ انہوں نے جاتے جاتے مولوی صاحب کو کچھ کاغذات سونپے اور کہا کہ یہ کسی بھی مل جانے والے انگریز کو دے دیں۔ ان کاغذات میں ایک خفیہ کوڈ میں انہیں ختم کرنے کے لئے کہا گیا تھا، چنانچہ کاغذات پانے والے انگریز نے انہیں فوراً گولی سے ماردیا۔ ۳۸

اگر چہ یہ واقعات مختلف کتابوں ذرا ذرا اختلاف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن ان سے نتائج پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ درج بالا واقعات کے بیان میں پروفیسر قریشی کے ارشاد کے برعکس کہ ''دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا''، باغیوں کی فہرست میں ان کے نام پائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ اس موقع پر ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے البتہ دونوں واقعات میں یہ بات مشترک ہے کہ اُن کی اموات ہنگامی طور پر یا فوری سزا کے تحت ہوئیں جبکہ مولانا فضل حق پر باقاعدہ مقدمہ قائم ہوا جس میں انگریزی عدالتی نظام کے لوازمات اپنائے گئے، استغاثہ نے ان کے خلاف گواہ پیش کئے، جرح ہوئی اور اِس کی روئداد پروفیسر قریشی کی کتاب میں شامل مالک رام کے مضمون میں موجود ہے جو مضمون نگار نے براہِ راست ان کے مقدمے کی مِسل سے اخذ کی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اِن تینوں اشخاص کی سزاؤں کو ایک جیسا قرار دینے کا پروفیسر موصوف کا تجزیہ درست نہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اگر مولانا فضل حق نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا تو انگریزوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک بے ضرر اور ''غیر باغی'' معروف شخصیت کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا تماشہ رچاتے اور اسے مجرم قرار دے کر کالے پانی کی سزا کا مستحق ٹھہراتے! سزا دہی کے اس عمل کی حکمت کے پیچھے تین مفروضے قائم کئے جاسکتے ہیں کہ:

مولانا نے بغاوت میں واقعی حصہ لیا تھا...... یا
اُن سے حکومت کو کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ تھا...... یا
انگریزوں کو اُن سے کوئی خاص قسم کی عداوت تھی۔

تینوں صورتیں مولانا کو انگریزوں کا مخالف ثابت کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی تالیف ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں مولانا عبدالحق صدر مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے والد مولانا فضل حق خیر آبادی کے متعلق بلاوجہ نہیں لکھا تھا کہ

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالمِ دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کیا تھا اور جنہوں نے اپنے جُرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا ہے کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دئے جائیں۔

پر ڈال دیا ہے:

''باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا جہاں تمام معاملات طے ہوتے تھے اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا، انہیں یہ کونسل اختیار کرتی تھی لیکن میں نے کبھی ان کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ انہوں نے اس طرح بدوں میری مرضی یا خلاف حکم صرف میرے ملازموں ہی کو نہیں لوٹا بلکہ کئی محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا، قتل کرنا، قید کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جو جی چاہتا تھا، کر گزرتے تھے۔ جبراً معزز اہلِ شہر سے اور تجار سے جتنی رقم چاہتے، وصول کرتے تھے اور یہ مطالبات اپنے ذاتی اغراض کے لئے کرتے تھے۔ جو کچھ گزرا ہے، وہ سب مفسدہ پرداز فوج کا کیا دھرا ہے۔ میں ان کے قابو میں تھا اور کر کیا سکتا تھا؟ وہ اچانک آپڑے اور مجھے قیدی بنا لیا۔ میں لاچار تھا اور دہشت زدہ۔ جو انہوں نے کہا، میں نے کیا وگرنہ انہوں نے مجھے کبھی کا قتل کر ڈالا ہوتا۔'' ۳۴

''مذکورہ بالا جواب میرا خود تحریر کردہ ہے اور بلا مبالغہ ہے، حق سے اصلاً انحراف نہیں کیا ہے۔ خدا میرا عالم وشاہد ہے کہ جو کچھ بالکل صحیح تھا، جو کچھ مجھے یاد تھا، وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں مَیں نے آپ سے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر ملاوٹ کے وہی لکھوں گا جو حق اور راست ہوگا، چنانچہ ایسا ہی میں نے کیا ہے۔'' ۳۵

غور فرمایئے کہ اگر عدالتی بیان کی بنیاد پر جنگِ آزادی کے سرفروشوں کی اس ساری جدوجہد کے مرکز بہادر شاہ ہی کو اس قصے سے نکال دیا جائے تو باقی کیا بچتا ہے؟ کیا اس صورت میں یہ جنگِ آزادی کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟ بہادر شاہ کے سوا اور کون تھا جو اُس دور کے ملکی حالات کے مطابق حکمران کہلاتا؟ ہمارے ہاں کسی جمہوریت کا تصوّر موجود نہ تھا جو انگریزوں پر فتح پانے کے فوراً بعد قابلِ عمل قرار پاتا اور ملک کا نظام چلایا جا سکتا۔ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود بہادر شاہ ہی سب کا مرکزِ نگاہ تھا۔ اگر اس پر یہ فردِ جرم عائد کی جائے کہ وہ باغی فوجوں کی دہلی میں آمد

کے بعد نہ چاہنے کے باوجود اُن کے ساتھ شرکت پر مجبور ہوا تو دوسری جانب یہ شواہد بھی موجود ہیں کہ وہ اپنے آباؤاجداد کی مانند مطلق العنان حکمرانی کا خواہشمند تھا جس کا اظہار اس نے کئی موقعوں پر کیا، اور ایسا کرنا انگریزوں کے نزدیک واقعی جرم تھا۔ پھر اس نے اپنے خلاف مقدمے میں خود کو بری الذمہ قرار کیوں دیا؟

جب ہم برِصغیر کی آزادی اور سیاسی جدوجہد کی مجموعی صورتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسے بیانات یہاں انگریزی عدالتی نظام کی بعض شقوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے دئے جاتے رہے ہیں۔ ایسا کرنا اصولی طور پر غلط ہے یا صحیح، اور کیا ایسا کرنے والے اپنی قربانیوں کی خود ہی توہین نہیں کرتے؟ اس سوال پر دورائیں ہوسکتی ہیں، لیکن حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ انہوں نے جدوجہد میں حصہ لیا۔ یہاں مولانا فضل حق کے معاملے میں اگر کوئی اس بات پر مُصر ہے کہ انہوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا تو اس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ انہیں سزا کس جرم میں ملی؟ پروفیسر قرشی اس کا جواب یوں دیتے ہیں:

> ''صرف ایک چیز جس نے انہیں جنگِ آزادی کا ہیرو بنادیا، ان کی سزائے عمر قید تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان دنوں بہت سے بے گناہ اور وفادار شہریوں کو فوجی عدالتوں کی طرف سے یا تو گولی ماردینے یا شدید جسمانی اذیتوں کی سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ صہبائی دہلی کالج کے استاد تھے اور مولوی محمد باقر دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر سے نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن دونوں کو محض اس وجہ سے گولی ماردی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں چھپے ہوئے انگریز پناہ گزینوں کی جانیں نہ بچاسکے تھے۔'' ۳۶

پروفیسر موصوف نے اس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی جو مثال دی ہے، وہ مولانا فضل حق کے حالات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی۔ دونوں صورتوں کا موازنہ کرنے کے لئے پہلے امام بخش صہبائی کا قصہ ان کے حقیقی بھانجے مولانا میر قادر علی کی زبانی سنئے:

اس غدار عالم دین کا کتب خانہ، جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا، اب کلکتہ
میں موجود ہے۔'' ۳۹

حوالہ جات

۱۔ ''غالب نام آورم'' بحوالہ ''امتیاز حق'' (راجا غلام محمد) مکتبہ قادریہ لاہور (۱۹۷۹ء) ص ۱۰

۲۔ مولانا فضل حق خیر آبادی (مرتبہ: افضل حق قرشی) الفیصل لاہور (۱۹۹۲ء) ص ۱۵۵

۳۔ Kotwal's Diary (Syed Mubarak Shah) Pakistan Historical Society, Karachi. (1994) p.49

۴۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۸۹

۵۔ ایضاً، ص ۹۰

۶۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد (غلام رسول مہر) کتاب منزل لاہور (۱۹۶۰ء) ص ۲۰۶

۷۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۱۵۶

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۱۰۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۰۵ (حاشیہ)

۱۱۔ غدر کی صبح شام (جیون لال کی ڈائری)، ہمدرد پریس دہلی (۱۹۲۶ء) ص ۲۲۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۱۷۔ غداروں کے خطوط، (سلیم قریشی/سید عاشور کاظمی)، انجمن ترقی اردو دہلی (۱۹۹۳ء) ص ۱۳۸

۱۸۔ غدر کی صبح شام، ص ۱۲۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۲۰۔ غداروں کے خطوط، ص ۱۳۲

۲۱۔ غدر کے فرمان (مرتبہ: خواجہ حسن نظامی) اہل بیت پریس دہلی (۱۹۴۴ء) ص ۱۲۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔۱۲۹

۲۳ Memoirs بحوالہ ''مولانا فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون'' (حکیم محمود احمد برکاتی) برکات اکیڈمی کراچی (۱۹۸۷ء) ص۸۳تا۸۵

۲۴ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص۱۵۶

۲۵ غدر کی صبح شام، ص۱۵۱۔۱۵۲

۲۶ ایضاً، ص۱۶۵

۲۷ ایضاً، ص۱۸۷

۲۸ غداروں کے خطوط، ص۱۵۴

۲۹ ایضاً، ص۱۵۹

۳۰ ایضاً، ص۱۶۴

۳۱ ایضاً، ص۱۷۰

۳۲ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص۱۲۲تا۱۲۴

۳۳ ایضاً، ص۱۴۸

۳۴ مقدمہ بہادر شاہ ظفر (مرتبہ: خواجہ حسن نظامی) الفیصل لاہور (۱۹۹۰ء) ص۱۶۱

۳۵ ایضاً، ص۱۶۳

۳۶ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص۱۶۳

۳۷ علماء ہند کا شاندار ماضی (سید محمد میاں) الجمعیۃ پریس دہلی (۱۹۶۰ء) جلد۴، ص۲۶۲

۳۸ اردو صحافت (مرتبہ: انور علی دہلوی) اردو اکادمی دہلی (۱۹۸۷ء) ص۸۸۔۸۹

۳۹ ہمارے ہندوستانی مسلمان (ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر) اقبال اکیڈمی لاہور (۱۹۴۴ء) ص۲۸۱

مفتی صدرالدین آزردہ اور جہادی

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں برِ صغیر کے مسلمان عوام الناس نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اور جن حُریت پسند رہنماؤں نے حتی المقدور ان کی رہنمائی کی، ان میں علمائے دین کی ایک قابلِ ذکر تعداد بھی شامل تھی۔ دوسری جانب انہی عوام کے ممتاز افراد میں سے بعض مخصوص ذہنیت کے مالک دل و جان سے انگریزی حکومت کے خیرخواہ تھے۔ انہیں قوم کے مقابلے میں ذاتی مفادات عزیز تھے۔ ان قوم فروشوں سے جہاں تک ممکن ہو سکا، اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق غیرملکی آقاؤں کو اس سرزمین پر مسلط رکھنے میں ہر قسم کی امداد مہیا کی۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کی حوصلہ شکنی کی۔ چند ایک نے تو ہم وطنوں کے خلاف تلوار اٹھانے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی۔ ان میں بعض افراد بظاہر تو عوام کے ہم رائے دکھائی دیتے تھے بلکہ ان کے ساتھ مشوروں میں شریک بھی ہوتے تھے مگر پس منظر میں نہایت گھناؤنی سازشوں میں مصروف تھے اور اس طرح انگریزی حکومت کو استحکام مہیا کرنے میں نہایت اہم اور خطرناک کردار ادا کرتے رہے۔ آستین کے سانپ پرچہ نویسی کی خدمات پر مامور تھے۔ جب ان کے سیاہ کرتوتوں کے طفیل عوامی بغاوت کچل دی گئی تو یہ لوگ اپنی خدمات کے صلے میں انعام و اکرام کے حق دار قرار پائے۔ پنشنیں مقرر ہوئیں، جاگیریں منظور ہوئیں، خلعات اور عطیات سے نوازے گئے اور اعلیٰ عہدوں پر ترقی اور خطابات سے سرفراز ہوئے۔ انہیں ہر قسم کی مراعات اور سہولتیں عطا ہوئیں جس سے وہ اور ان کے بیٹے

پوتے کئی عشروں تک اس بے بس قوم کے نمائندے بن کر غلامی کو تقویت بخشتے رہے۔

بعض افراد ایسے بھی تھے جنھوں نے بعد میں دو کشتیوں میں پاؤں رکھے، حُرّیت پسندوں کے ساتھ بھی شریک اور در پردہ حاکموں سے بھی راہ و رسم تاکہ کسی بھی فریق کے کامیاب ہونے کی صورت میں ان کے ہم رکاب قرار پائیں۔ انہوں نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے یہ سوچ کر کہ یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکے گی، انگریزوں کے جاسوسوں کی وساطت سے انہیں اپنے تعاون کی پیشکش کی۔ انگریز اُن سے کہیں سیانے تھے، انہوں نے ایسے موقع پر ان کی ایسی پیشکشوں پر خاموش رہنا مناسب سمجھا اور اپنی کامیابی کے فوراً بعد انہیں اس وقت تک زیرِ حراست یا زیرِ حفاظت رکھا جب تک کہ اُن کے معاملات کی تحقیق نہ کر لی۔ اس کے بعد ان کے مبینہ ''تعاون'' کی حقیقت اور مقدار کے مطابق ان کے ساتھ جو مناسب سمجھا، سلوک کیا۔ ان میں سے بعض پھانسی کے تختوں پر بھی جھولے، کالے پانی بھیجے گئے، جیلوں میں ڈالے گئے اور جائدادوں کی ضبطیاں ہوئیں۔ جو رعایت کے مستحق ٹھہرے، انہوں نے معافی پائی اور ان کی ضبط شدہ جائدادیں مکمل یا جزوی طور پر واگزار ہوئیں۔ جب ہم نے اپنی گزشتہ تاریخ کو قومی نقطۂ نظر سے رقم کرنا شروع کیا اور ایسے ''نیک نام'' اشخاص کی وطن دشمنی کے حالات دریافت ہوئے تو اُن کی اصلیت سامنے آئی۔ جن کا کچا چٹھا ہمیں میسر نہ آسکا، وہ اس ردِ عمل سے محفوظ رہے۔ ایسی بعض ''شخصیات'' کے سیاہ کرتوتوں کی تفصیلات آہستہ آہستہ دستیاب ہو رہی ہیں۔

ان مشہور شخصیات میں جو دہلی کے محاصرے کے دوران بہادر شاہ ظفر کے دربار سے متعلق رہیں، ان میں مفتی صدر الدین آزردہ بھی تھے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ سرکاری ملازم تھے اور دہلی میں باغی فوجوں کے داخلے کے وقت تک بطور ''صدر الصدور'' اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ علمی لحاظ سے ان کا شمار چوٹی کے علما و فضلا میں کیا جاتا تھا۔ مصنف ''حدائق الحنفیہ'' کے مطابق:

> ''مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشا، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ

میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے''۔ [۱]

وہ اپنی پیشہ ورانہ و علمی مصروفیتوں کا تذکرہ اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات کے دوران میں فتویٰ دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبہ مدرسہ سرکاری کا امتحان لینا، احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزار ہا کاغذات پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آ کر طالب علموں کو پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب دینا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم (ثالث) ہونا، مجلس شادی و غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت میں گرم رہنا، باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔'' [۲]

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب باغی فوجیں دہلی میں اچانک داخل ہوئیں اور انگریزی نظم و نسق درہم برہم ہو گیا تو مفتی صاحب عدالت چھوڑ گھر جا بیٹھے۔ شہر میں کسی قسم کا کوئی قانون نافذ نہ تھا اور ہر جانب افراتفری تھی۔ ڈائری نویس جیون لال ۱۴ مئی کے تحت اپنے روزنامچے میں تحریر کرتا ہے:

''بادشاہ نے مولوی صدرالدین خاں بہادر کو بلایا اور انہیں شہر کا مجسٹریٹ مقرر کر دیا تاکہ وہ مقدمات کا غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں مگر مولوی صاحب نے عدمِ صحت کی بنا پر معذوری چاہی۔'' [۳]

اسی تاریخ کے تحت چنی لال اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

''......مولوی صدرالدین حاضر ہو کر آداب بجالائے۔ مولوی صاحب نے ایک طلائی مہر پیش کی۔ بادشاہ نے انہیں عدالت دیوانی و جوڈیشل کورٹ کا منصف مقرر کیا مگر مولوی صاحب نے عرض کی کہ مجھے معافی دی جائے۔'' [۴]

عدمِ صحت تو ایک بہانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اس سے قبل عدالتی فرائض بخوبی انجام دے ہی رہے تھے اور دو تین دن میں صحت نے کیا تنزلی اختیار کر لی تھی کہ وہ عارضی طور پر نہیں بلکہ اس عہدہ ہی کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بعد کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ معذرت کے باوجود انہیں عدالتی ذمہ داریاں سونپ دی گئی تھیں۔ جیون لال ۲۷ جولائی کے تحت اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ''مولوی صدرالدین کو حکم دیا گیا کہ اس وقت تک فوجداری مقدمات کی سماعت کریں جب تک کہ انگریزوں پر فتح حاصل ہو''۔ [۵]

اسی طرح ۱۲ راگست کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دربار میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اس کے مطابق جب حکیم احسن اللہ خاں کا مال واسباب اس شبہ کی بنیاد پر لوٹ لیا گیا کہ وہ انگریزوں کی خیر خواہی میں سازشیں کرتا ہے تو ''بادشاہ نے مولوی صدرالدین سے کہا کہ جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال، جسے سپاہیوں نے لوٹ لیا تھا، واپس نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک تمہیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جائے گی''۔ [۶]

ان دنوں عالم یہ تھا کہ دہلی میں ساٹھ ستر ہزار سپاہی اور جہادی جمع ہو چکے تھے لیکن خزانہ خالی تھا اور بادشاہ کے پاس سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ سپاہی آئے دن دربار میں آ کر بادشاہ سے تنخواہ کا تقاضا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے شہر کے مالدار افراد اور مہاجنوں سے عطیات اور قرضے لئے جاتے تھے۔ اکثر امرا روپیہ مہیا کرنے سے انکار کر دیتے تھے یا بہانے تراشتے تھے۔ سپاہی ان سے زبردستی وصولیاں کرتے تھے یا پھر ان کا سامان لوٹ لیا کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین کا شمار اہلِ ثروت میں ہوتا تھا اور ان سے بھی رقم کا تقاضا کیا جاتا تھا۔ تراب علی جاسوس ۱۲ راگست کی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ''مفتی صدرالدین کو ایک لاکھ روپے دینے کے لئے روز تنگ کیا جاتا ہے''۔ [۷] اس سے قبل ۹ راگست کی ڈائری محررہ جیون لال میں بیان کیا گیا ہے کہ ''مولوی صدرالدین کے مکان پر آج پچاس سپاہیوں نے حملہ کیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہاں ستر جہادی مقابلے کے لئے تیار ہیں، وہ واپس آ گئے''۔ [۸]

مفتی صدرالدین رقم کا مطالبہ پورا کرنے سے قطعی انکاری تھے۔ فتح محمد جاسوس یکم ستمبر کی رپورٹ میں لکھتا ہے:

''مفتی صدرالدین کو رقم کی فراہمی کے لئے دربار میں طلب کیا گیا تھا۔ اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت سے غازیوں کو چوبیس روپے روزانہ کی تنخواہ کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس نے نہ صرف بادشاہ کو کوئی رقم دینے سے انکار کر دیا ہے بلکہ دھمکی دی ہے کہ اگر اسے زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ شاہی فوج کے خلاف لڑ کر مرنے کو تیار ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ انگریزی فوج کی نسبت ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کو ترجیح دے گا۔'' [۹]

اس سے پیشتر مفتی صدرالدین تراب علی جاسوس کے ذریعے انگریزوں سے باقاعدہ خط و کتابت کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اس وقت دہلی کی انٹیلی جنس کا سربراہ ہڈسن تھا اور منشی رجب علی اس کے نائب کے طور پر سرگرمِ عمل تھا۔ تراب علی اپنی رپورٹ محررہ ۲۳ راگست میں اپنے افسروں کو تحریر کرتا ہے کہ ''کل میں نے آپ کے نام مفتی صدرالدین کا ایک خط بھیجا تھا''۔ [۱۰] باوجودیکہ انہوں نے ذاتی طور پر رقم دینے سے قطعی طور پر انکار کیا مگر چونکہ ظاہراً وہ دربار سے بھی منسلک تھے، اس لئے وہاں کے فیصلوں میں انہیں بھی شریک کیا جاتا تھا کیونکہ ان کی سازشی مصروفیات خفیہ تھیں۔ فتح محمد خاں جاسوس کی ان کے انکار سے اگلے روز کی درجِ ذیل رپورٹ درباری فیصلے کے مطابق رقم جمع کرنے میں ان کے تعاون کے وعدے کا پس منظر اور اُن کی وقت نبھانے کی حکمتِ عملی واضح کرتی ہے:

''دہلی کے شہریوں سے ایک لاکھ روپیہ چندہ جمع کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے مسلمانوں کی ذمہ داری مفتی صدرالدین اور ہندوؤں کی ذمہ داری لالہ مکندلال کو دی گئی ہے۔ ان دونوں نے پندرہ دن کے اندر یہ رقم جمع کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ انہیں پوری امید ہے کہ اس وقت تک انگریز دہلی فتح کر چکے ہوں گے۔'' [۱۱]

اور اتفاق سے مفتی صدرالدین کی یہ توقع واقعی پوری ہوئی۔

تراب علی کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز اپنے قابلِ اعتماد جاسوسوں کے

ذریعے مرزا الٰہی بخش اور مفتی صدرالدین جیسے لوگوں سے شاہی افواج کی تنظیم میں بھی حسبِ منشا تبدیلیاں کروا لیتے تھے۔ وہ اپنی ۲۵ راگست کی رپورٹ میں لکھتا ہے:

''آپ کے ایما بموجب میں نے مرزا الٰہی بخش اور مفتی صدرالدین صاحب سے عرض کر کے سکھوں کو ہر پلٹن سے نکلوا کر علیحدہ پلٹن سکھوں کی بنوائی تھی۔ چونکہ جواب خط مفتی صاحب اور مرزا صاحب کا نہیں آیا، میری عرضی کو محمول بر خودغرضی کیا اور اس کام کے انجام میں کم توجہ کیا، اس واسطے پھر سکھ لوگ متفرق ہو کر اپنی اپنی پلٹنوں میں داخل ہو گئے۔'' [12]

متذکرہ بالا رپورٹ میں خطوں کا جواب نہ دینے کا معاملہ دراصل انگریزوں کی ایک حکمتِ عملی تھی۔ منشی رجب علی جیسے لوگ، جو شروع ہی سے ان کے شریک کار رہے، ان کے لئے زیادہ قابلِ اعتماد تھے۔ جوں جوں محاصرہ طول پکڑتا گیا، کچھ بااثر اور خودغرض افراد نے اپنے مفادات کے تحت انگریزوں سے رجوع کرنا شروع کیا۔ انگریزوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے شہر کے اندر سے پل پل کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ وہ باغی فوج میں انتشار اور ان کے پاس خوراک اور اسلحہ کی کمی سے بھی مکمل طور پر آگاہ تھے، لہٰذا انہیں شہر پر قبضہ کر لینے کا پورا پورا یقین تھا۔ وہ صرف برطانیہ سے آنے والی کمک کے وہاں پہنچنے کے منتظر تھے۔ اس امر کی تصدیق اس مراسلت سے بھی ہوتی ہے جو انگریز کمشنر گریٹ ہیڈ اور گورنر کالون کے درمیان ہو رہی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ لوگ آخری وقت میں ان کا ساتھ دینے کی پیشکش مجبوراً کر رہے ہیں اور اگر ان کی پیشکش کو قبول کر لیا گیا تو ایسے لوگوں کو شہر پر قبضہ کے بعد اخلاقی طور پر رعایات دینے ضروری ہو جائے گا۔ انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے، ان کی سابقہ کارگزاریاں موجودہ پیشکش کے مقابلے میں شدید تر ہوں، اس لئے وہ وقت آنے پر انفرادی معاملات کو جانچ پرکھ کر ان کے متعلق فیصلے کریں گے۔ انہوں نے ان افراد کے ساتھ خط و کتابت کو بے فائدہ سمجھا اور یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ کسی کو جواب نہ دیا جائے۔ اس کا ثبوت کمشنر دہلی کے مراسلہ بنام گورنر اور اس کے جواب میں ملتا ہے۔ کمشنر گریٹ ہیڈ نے ۱۸ راگست کے خط میں

تحریر کیا کہ ''کل مجھے شہزادہ الٰہی بخش کا ایک خط ملا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ ہمارے لئے کیا خدمت بجالاسکتا ہے، مگر میں اس کے ساتھ مراسلت میں نہیں پڑوں گا۔'' [۱۳] اسی طرح چند شہزادوں کی اسی قسم کی پیشکش پر بھی اسی ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ [۱۴] گورنر نے جواب میں لکھا کہ ''آپ نے اچھا کیا جو شہزادوں کے ساتھ مراسلت میں نہیں پڑے''۔ [۱۵]

مفتی صدرالدین اور اس کے ساتھیوں کی پیشکش کا دائرہ کہاں تک وسیع تھا، وہ تراب علی کی درجِ ذیل رپورٹ محررہ ۳۰ راگست سے ظاہر ہوتا ہے:

''حکیم احسن اللہ خاں، مفتی صدرالدین، مرزا الٰہی بخش اور بیگم زینت محل سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق انگریزی حکومت کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ سب کشتیوں کے پلوں کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔'' [۱۶]

بالآخر انگریز دہلی میں داخل ہو گئے اور مفتی صدرالدین کا وہ تمام سامان انگریزی فوج کے سپاہیوں نے لوٹ لیا جسے بچانے کے لئے انہوں نے جہادیوں پر رقمیں خرچ کی تھیں، شاہی افواج کے ساتھ لڑ مرنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا اور انگریزوں کو اہلِ وطن کی لٹیا ڈبونے کی پیشکش کی تھی۔ غالب اپنے ایک خط محررہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

''مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے، کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹیننٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں، کرائے پر معاش کا مدار ہے۔'' [۱۷]

نصف جائداد کی ضبطی غالباً اس ''جرم'' میں برقرار رہی ہوگی کہ سرکاری افسر ہوتے ہوئے انہوں نے سرکارِ برطانیہ کے لئے وہ کچھ نہیں کیا جو اُن سے توقع کی جاسکتی تھی۔

دہلی کے کوتوال سید مبارک شاہ نے اپنی ڈائری میں برطانوی حکومت کی خیرخواہ

بعض معروف شخصیات کے ذکر میں مفتی صدرالدین کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جو لوگ برطانوی حکومت کے خیر خواہ تھے، ان کے دِلی خیالات صرف ان کے ظاہری اعمال ہی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''شہر کے صدرالصدور مفتی صدرالدین کو بھی اسی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ شہزادوں اور فوج دونوں نے انہیں بار بار اِس امر کا فتویٰ جاری کرنے کو کہا کہ وہ جس جہاد میں مصروف ہیں، وہ جائز اور درست ہے اور خدائی خوشنودی کا باعث ہے۔ مفتی صاحب نے ایسا کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔'' [۱۸]

البتہ ۱۸۵۷ء کے بعض تذکروں میں انگریزوں کے خلاف ایک فتوے کے دستخط کنندگان میں ان کا نام بھی شامل دکھائی دیتا ہے۔ [۱۹] اس ضمن میں مفتی صاحب سے متعلق درجِ ذیل روایت دلچسپی کی حامل ہے:

''اس موقع کا ایک علمی لطیفہ زبان زدِ خاص و عام ہے، یعنی مفسدوں نے آپ سے جوازِ جہاد کے فتوے پر زبردستی مُہر کرانی چاہی تو آپ نے مُہر کے ساتھ یہ الفاظ بھی لکھ دئے: ''فتویٰ بالجبر''۔ مفسدوں نے اس لفظ کو ''بالخیر'' سمجھ کر پیچھا چھوڑ دیا، مگر جب بعد از فتح دہلی دفتر سے وہ کاغذ برآمد ہوا تو سرکار نے پکڑا اور جواب طلب کیا۔ آپ نے ''فتویٰ بالجبر'' ثابت کر کے رہائی پائی۔'' [۲۰]

اُس دَور کے نواب غلام حسین خاں کی ایک فارسی قلمی کتاب محررہ ۱۸۵۷ء میں عمائدینِ دہلی کے مختصر حالات میں ان کا ذکر بھی موجود ہے جس کا ترجمہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

''مولانا مولوی صدرالدین خان ۳۵ سال سے انگریزوں کے ملازم تھے۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اب پچیس سال سے دہلی کے صدرالصدور تھے۔ بڑے ایماندار حاکم تھے۔ اہلِ مقدمہ ہمیشہ ان کے انصاف سے خوش رہتے تھے۔ سرکار انگریزی کے بہت خیر خواہ تھے۔ جب

غدر میں کچہریاں اور دفتر جلا کر خاک سیاہ کر دئے گئے تو یہ بھی گھر میں بیٹھ رہے۔ پھر بادشاہ کے بلانے سے مجبور ہو کر جبراً قہراً قلعہ میں عدالت کا کام کرنے لگے۔ انگریزوں کے فتوے پر انہوں نے باغیوں کے جبر سے مہر لگا دی۔ جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہ بھی اسی جرم میں گرفتار ہو گئے لیکن چونکہ پہلے بڑی نیک نامی اور دیانت سے ملازمت کر چکے تھے، لہٰذا سابقہ کارگزاریوں کے باعث چند مہینے نظر بند رہ کر رہا ہو گئے۔ پھر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں ایک مختصر مکان لے کر وہیں رہنے لگے۔'' [۲۱]

آخر میں ان کی ایک نظم کے پہلے دو شعر، جو اُس دور کے حالات کے بارے میں ان کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں:

آفت اس شہر پہ قلعہ کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی

روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی [۲۲]

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم (سید محمد میاں) مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی (۱۹۶۰ء)، ص ۲۴۳

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۷

۳۔ غدر کی صبح شام (روزنامچہ جیون لال) مطبوعہ دہلی (۱۹۲۶ء) ص ۱۰۷

۴۔ مقدمہ بہادر شاہ ظفر (مرتبہ خواجہ حسن نظامی) الفیصل لاہور (۱۹۹۰ء) ص ۱۲۷

۵۔ غدر کی صبح شام، ص ۱۸۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۱۴

۷۔ غداروں کے خطوط (سلیم قریشی) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی (۱۹۹۳ء) ص ۱۴۷

۸۔ غدر کی صبح شام، ص ۲۱۲
۹۔ غداروں کے خطوط، ص ۱۶۸
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۰
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۲
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۳
۱۳۔ انڈین میوٹنی انٹیلی جنس ریکارڈز (جلد اول) مرتبہ سر ولیم میور مطبوعہ ایڈن برگ (۱۹۰۲ء) ص ۴۷۱
۱۴۔ ایضاً، ص ۴۷۸
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۴۳
۱۶۔ غداروں کے خطوط، ص ۱۶۴
۱۷۔ غالب اور سن ستاون (ڈاکٹر سید معین الرحمن) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی (۱۹۸۸ء) ص ۲۹۶
۱۸۔ Kotwal's Diary (Syed Mubarak Shah) Pakistan Historical Society, Karachi (1994) p.49
۱۹۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (محمد ایوب قادری) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۴۰۵
۲۰۔ ''خم خانہ جاوید از لالہ سری رام'' بحوالہ ''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء'' ص ۴۱۴
۲۱۔ دِلّی کی سزا (غلام حسین خاں) دلّی پرنٹنگ پریس دہلی (۱۹۴۶ء) ص ۵۵۔۵۶
۲۲۔ گلِ خنداں لاہور (انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر) ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۱

مولوی سیّد امداد العلی کی وفاداریاں

مولوی سید امداد العلی علمی حلقوں میں سرسیّد احمد خاں کے دینی افکار کے ایک بہت بڑے مخالف کے طور پر معروف ہیں۔ وہ ان دو علما میں سے ایک تھے جنہیں الطاف حسین حالی نے سرسید کا بدترین مخالف قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ''ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں، ان کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں''۔ [1] سرسید نے جب ہندوستان کے مسلمانوں میں مروّج بعض دینی عقائد کے خلاف تصنیف و تالیف شروع کی اور ۱۸۶۸ء میں انگریزوں کے ذبیحہ کے حلال ہونے کے جواز میں ''احکام طعام اہلِ کتاب'' شائع کی تو مولوی امداد العلی نے اس کی تردید میں رسالہ ''امداد الاحتساب...... '' لکھ کر سرسید کے خیالات کا بطلان کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوا جو متعدد رسائل کی اشاعت کا سبب بنا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کے مخالفت میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو انگریز کے مخالف تھے مگر حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ اس کی مثال متذکرہ دونوں شخصیات ہیں۔ مذہبی افکار کے برعکس وہ ہندوستان میں انگریزی تسلط کے معاملے میں وہ یک زبان اور متفق الکلمہ تھے، یہاں تک کہ وہ برطانوی حکومت کے استحکام کے لئے اپنی جانوں تک کے نذرانے پیش کرنے پر تیار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دونوں سیّد معزز سرکاری افسر تھے۔ سرسید بجنور میں صدر امین کی حیثیت سے تعینات تھے اور سید امداد العلی متھرا میں ڈپٹی کلکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

دونوں نے اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کی حمایت میں سرگرمِ عمل رہے۔ انہوں نے ''باغیوں'' کے ہاتھوں بڑی مشکلات سہیں اور مختلف مواقع پر اپنی خیر خواہی، وفاداری اور جاں نثاری کے ثبوت مہیا کئے۔ سرسید ایسے خوش قسمت تھے کہ متعدد مواقع پر اپنی جان قربان کر دینے کے ارادے سے خطروں میں کود پڑنے کے باوجود کسی قسم کی جسمانی گزند سے محفوظ رہے مگر سید امداد العلی حکومت کے حق میں کارروائیوں کے عملی مظاہروں میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جھڑپوں میں زخمی بھی ہوئے۔ اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر سید امداد العلی نے سرسید کے خلاف ایک رسالے میں اُن کے اس الزام کی تردید کی کہ وہ ہمدردی کو کفر خیال کرتے ہیں اور ثبوت کے طور پر ان الفاظ میں سرسید پر سبقت حاصل کرنے کا دعویٰ کیا:

''ہمدردی کا لفظ زبان سے کہنا اور منہ سے بک ڈالنا، ایسے وقت میں کہ جو امتحان کا وقت نہیں ہے، اب سید احمد خاں بہادر کا آسان ہے مگر وہ وقت ہمدردیوں کے امتحان کا غدر کا وقت تھا۔ کیا یہ بھی کوئی ہمدردی ہے کہ بجنور سے اُٹھے، راجہ پرتاپ سنگھ کے ہاں جا ٹھہرے؟ وہاں سے اُٹھے تو پھراؤں ضلع مراد آباد میں جا کر آرام فرمایا۔ دہلی آپ کا وطن تھا۔ دیکھا کہ وہ باغیوں اور مفسدوں سے گھرا ہے اور دہلی والوں کو شکست نصیب ہو چکی ہے تو آپ جھٹ میرٹھ میں تشریف فرما ہوگئے۔ آپ کو دعویٰ تو بڑی بڑی ہمدردیوں کا ہے مگر افسوس کہ کسی مقام پر باغی کے مقابلے میں بھاگنے کے وقت تک کوئی لاٹھی اپنی پشت مبارک پر نہ کھائی، زخم تلوار یا بندوق کی گولی تو چیز ہی دوسری ہے۔ پس جس خیر خواہ سرکار کی نسبت یہ سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں یہ ظن رکھتا ہے کہ وہ ہمدردی کو کفر خیال کرتا ہے، اس تحریر کا محاکمہ میں حُکامِ وقت اور جملہ مسلمانان واہلِ ہنود پر چھوڑتا ہوں کہ آیا جو شخص سینہ سپر ہو کر بہ نظرِ نمک حلالی اپنے آقا کے سینہ پر گولی باغیوں کی کھائے اور ہزار ہا روپیہ کا مال ان سے چھڑائے اور وہ گولی چھ مہینے بعد ڈاکٹر رے صاحب بہادر نکالیں کہ جس کا خون مسٹر لو صاحب، داماد لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر، اور جینٹ

صاحب، کلکٹرو مجسٹریٹ متھرا پوچھتے جائیں اور اُس گولی کا نشان تصدیق ایک تمغہ ہمدردی اور نمک حلالی ملکہ معظمہ کا جس بہادر کے سینہ پر موجود ہو تو انصاف فرمایا جائے کہ کیا وہ شخص ہمدردی کو کفر سمجھنے والا ہو سکتا ہے یا کہ جو اُس کو ایسا لفظ کہے اور طعن دے؟ بے شک ایسا ہی شخص تمام دنیا کا جھوٹا، مفسد، حاسد اور خبیث النفس ہے۔'' [۲]

سید امداد العلی اپنی ان خدمات کے صلے میں ''میوٹنی میڈل'' سے بھی سرفراز ہوئے۔ سرسید نے اپنے ایک خطاب میں اس بات کا ذکر ایک خاص انداز میں یوں کیا:

''ایامِ غدر میں انہوں نے بہت کچھ خیر خواہی انگریزی گورنمنٹ کی کی ہے۔ میوٹنی میڈل، جس میں جناب ملکہ معظمہ وکٹوریا کی تصویر ہے، ان کو ملا ہے۔ اس کو پہنتے ہیں اور نہایت فخر کرتے ہیں۔ ہر ایک انگریز سے نہایت عاجزی سے پیش آتے ہیں اور اگر کبھی نواب لفٹینٹ گورنر بہادر صاحب مجلس میں ہوتے ہیں تو اپنا دل اور اپنی آنکھیں فرشِ راہ کرتے ہیں۔'' [۳]

سید امداد العلی نے رسالہ ''امداد الآفاق برجم اہل النفاق'' میں اپنی خیر خواہی کے ثبوت میں انگریزوں کی آراء کے تراجم شامل کئے ہیں۔ مسٹر وکرم منی نے اپنی چٹھی میں اُن کی وفاداری اور جاں نثاری کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے تحریر کیا:

''مجھ کو نہایت خوشی ہے اس خیر خواہی کی تصدیق کرنے میں جو امداد العلی نے شروع سے تا نہایت برے وقت اس ایامِ تکلیف میں ظاہر کی۔ میں جون ۱۸۵۸ء میں متھرا کے ضلع کوسی میں، جہاں کہ وہ تحصیلدار تھے، ایسے وقت میں گیا تھا جبکہ بغاوت روز بروز پھیلتی تھی اور نہایت خوفناک کیفیتیں روز پہنچتی تھیں، اور جب باغیوں کا پہلو نہایت زور میں تھا اور بند نہیں ہو سکتے تھے، اور جب روز بروز ہم لوگ کے کارخانے کی تیرگی ہوتی جاتی تھی۔ اس نہایت آزمائش کے تمام ایام میں امداد العلی نے نہایت مستحکم اور بے ریا خیر خواہی سرکار کی قائم کی اور اپنے مقام پر، جب تک کہ ایک عرصے تک

حفاظت چاروں کی نہیں ہوگئی تھی، موجود رہے۔ واقع میں نہایت معلق خطرہ میں ایسے لوگوں سے پڑے ہوئے تھے جو علانیہ ان کو مار ڈالنے کے لئے متلاشی تھا، بسبب ہونے ایک دوست اور رفیق صادق سرکار کے۔'' [۴]

لیفٹیننٹ گورنر نے ان کے کردار کو اِن الفاظ میں سراہا:

''میں کسی شخص کو نہیں جانتا جو ہم لوگوں کا مستحق زیادہ ہے واسطے اپنے خیر خواہی اور ایمانداری اس آزمائش کے ایام میں، امداد علی ہے۔'' [۵]

کلکٹر کیفرڈ جنٹ مجسٹریٹ نے ایک اور اہل کار کے مقابلے میں اُن کی یوں تعریف کی:

''اگر غلام حسین کو تیزی اور چالاکی امداد العلی کی سی ہوتی، مجھ کو شک نہیں کہ وہ خزانہ، جو باغی بعد پہلے بلوے کے چھوڑ گئے تھے، کبھی لٹ نہ جاتا اور حصہ کثیر ہم لوگوں کے مال کا فوراً شہر میں انتقال ہوتا اور بچ جاتا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ غلام حسین چالاک اور تیز آدمی نہیں ہے۔ اس کا مقابلہ اور کسی دوسرے حاکم کا مقابلہ امداد العلی کے وزن سے کرنا کبھی درست نہیں کیونکہ امداد العلی یکتا ہے اور مجھ کو شبہ ہے کہ کسی شخص نے ان ممالک مغربی وشمالی میں ایسی خیر خواہی سرکار کی کی ہو۔'' [۶]

۱۸۵۷ء کے دوران سرکاری خط و کتابت اور انٹیلی جینس رپورٹوں پر مشتمل سر ولیم میور کے مرتب کردہ ایک مجموعے متعدد مقامات پر اُن کی سرگرمیوں اور ''کارناموں'' کا ذکر ملتا ہے۔ چند ایک ملاحظہ فرمایئے:

☆ (۳۰/اگست) ''ایک دیسی ڈپٹی کلکٹر اور مجسٹریٹ مسلمان نے بڑے امن اور سکون کے ساتھ متھرا کو ہمارے حق میں سنبھال رکھا ہے۔'' [۷]

☆ (۱۸/اکتوبر) ''ایسے لوگ، جو ہماری مخالفت نہیں کرتے، اس کا نمایاں ثبوت متھرا اور بندرابن میں ملتا ہے جہاں کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ امداد علی ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے ماتحت ہمارے دیسی افسران نے وہاں باقاعدگی کے ساتھ اس وقت تک نظم ونسق بحال رکھا

، جب تک کہ دشمن نے انہیں طاقت کے دھکیل نہیں دیا۔ کئی مرتبہ جب باغی فوجوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کیا، وہ پیچھے ہٹ گئے اور ہر بار انہوں نے برضا و رغبت اطاعت شعار لوگوں پر فرمانروائی بحال کی۔ آخری بار اندور کے فوجی دستے کے بھگوڑے چند روز قبل بھاری تعداد میں متھرا میں پہنچے۔ ان میں سے کچھ شہر میں گھس گئے، پولیس پر حملہ کیا اور رسد مہیا کرنے کا مطالبہ کیا۔ ڈپٹی کلکٹر نے باشندوں کی مدد سے ان لوگوں کو پسپا کر دیا۔ دو گھنٹے تک دونوں فریقوں کے درمیان بندوقوں سے فائرنگ ہوتی رہی اور آخر کار سارے باغی بھاگ جانے پر مجبور ہو گئے۔'' [8]

☆ (۲۰ ستمبر) ''امداد العلی ڈپٹی کلکٹر نے متھرا سے ایک روبکاری تحریر کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کے ایک پیغام برنے، جو دہلی سے پیر کو روانہ ہوا، بتایا ہے کہ ہم نے شہر میں گرجے پر قبضہ کر لیا تھا۔ منگل کو ہم ایلن بروٹینک تک جا پہنچے۔ بدھ اور جمعرات کے حملہ میں تمام شہر پر قابو پا لیا گیا...... وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بدھ کے روز کمپنی کی حکومت کے دوبارہ قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ ان خبروں کی بنیاد پر امداد العلی نے متھرا میں دہلی کی فتح کی منادی کر دی ہے۔ ہمیں البتہ دیسی رپورٹوں پر زیادہ خوش فہم نہیں ہو جانا چاہیے۔ یہ وہی امداد العلی ہے جس کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی حامل رپورٹ سے ہم نے جون کے وسط میں باور کر لیا تھا کہ دہلی فتح ہو گیا ہے۔'' [9]

☆ (۲۵ نومبر) ''متھرا سے ہمیں خوفزدہ آبادی کی بہت سی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔ چوبیس تاریخ کو بعد از دوپہر چار پانچ سو پیادہ اور سوار شہر میں داخل ہوئے۔ ان کے مایوس اور پریشان دکھائی دینے والے چہروں پر اُن کی شکست کے آثار نمایاں ہیں لیکن وہ حسبِ معمول بے لگام اور متشدّد ہیں۔ انہوں نے ہمارے افسروں کو وہاں سے نکال دیا۔ امداد العلی

بڑی دانائی کے ساتھ روپوش ہوگیا ہے۔'' ۱۰

☆ (۶/اکتوبر) ''متھرا میں بالکل سکوت ہے۔ چار تاریخ کو جونہی باغی کافی دُور چلے گئے تو امداد العلی ڈپٹی کلکٹر نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ شہر بالکل وفادار اور خاموش ہے۔'' ۱۱

☆ (۱۹/اکتوبر) ''......کیا متھرا ہمارے ساتھ وفاداری کی ایک نادر نظیر نہیں ہے؟ جب سے کہ بغاوت پھوٹی ہے، ہمارا ایک بھی سپاہی یہاں نہیں آیا، سوائے ......دو کمپنیوں کے جنہوں نے بغاوت کی اور دہلی کو چلی گئیں۔ پھر بھی جب کبھی باغی فوجوں کا حقیقی دباؤ گزر گیا تو فوراً ہی ہماری کوتوالی میں کام شروع ہوگیا اور ہمارے ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر امداد العلی کو اس اطاعت گزار شہر کا پھر حاکم تسلیم کرلیا گیا۔'' ۱۲

☆ (۲۲ جنوری ۵۸ء) ''متھرا سے تقریباً بیس میل شمال کے ایک موضع میں کچھ گڑ بڑ ہے۔ وہاں ایک فقیر نے ہنگاموں کے دوران حکومت کی عمارتی لکڑی کی ریلوے چوکیوں پر قبضہ کرلیا اور ہمارا قبضہ بحال ہونے پر دست برداری سے انکار کردیا۔ ڈپٹی کلکٹر امداد العلی سے امید تھی کہ وہ اسے مصالحانہ انداز میں ایسا کرنے پر آمادہ کرسکے گا۔ چونکہ متھرا میں کسی قسم کے فوجی دستے فراہم نہیں، کرنل فریزر نے طاقت کے زور پر کوئی کوشش کرنے سے منع کیا مگر امداد العلی نے اس جگہ پر حملہ کردیا اور دیکھا کہ وہ جگہ ایک دیوار کی محافظت میں ہے، لہٰذا وہ وہاں سے واپسی پر مجبور ہوا۔ امداد العلی ایک متصل گاؤں میں مقیم ہے جسے وفادار ہمسایہ زمینداروں کے بہت سے بندوق بردار آدمیوں نے گھیر رکھا ہے۔'' ۱۳

حوالہ جات

۱۔ حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ دوم، ص ۲۷۷

۲۔ مضحکات و مطائبات سرسید (مرتبہ: شیر علی خاں سرخوش) گیلانی برقی پریس لاہور (ب۔ت) جلد اول، ص ۹۱

۳۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۱۳۵

۴۔ ''امداد الآفاق برجم اہل النفاق'' بحوالہ ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' (محمد ایوب قادری) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۵۱۶

۵۔ ایضاً ص ۵۱۷

۶۔ ایضاً

۷۔ Records of the Intelligence Department (Sir William Muir) T. & T. Clark, Edinburgh. (1902) Vols. I & II.
(حصہ دوم، ص ۱۵۳)

۸۔ ایضاً، حصہ اول، ص ۴۶

۹۔ ایضاً ص ۹۸۔۹۹

۱۰۔ ایضاً ص ۱۱۳

۱۱۔ ایضاً ص ۱۷۷

۱۲۔ ایضاً ص ۲۰۵

۱۳۔ ایضاً ص ۳۵۶

سرسیداورسنہ ستاون

عوامی سطح پر سرسید احمد خاں کی خدمات کا ذکر اُن کی تصنیف المعروف ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' سے شروع کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اِس میں انہوں نے اُن اسباب کا ذکر کیا ہے جو اُن کے خیال میں اِس بغاوت کا باعث ہوئے۔ دراصل اس مضمون کا عنوان تھا ''کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟'' جو ''اسبابِ سرکشی ہندوستان کا جواب مضمون'' کے نام سے اور ''سید احمد خاں صدر الصدور مراد آباد'' کی تالیف کی حیثیت سے ۱۸۵۹ء میں آگرہ میں طبع ہوا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ سرکاری طور پر انگریزی میں کیا گیا اور انگلستان کی پارلیمنٹ میں اس پر مباحثے ہوئے۔ اس سے قبل ۱۸۵۸ء میں سرسید ''سرکشی ضلع بجنور'' شائع کر چکے تھے جس میں انہوں نے اپنے اُن ذاتی مشاہدات اور حالات کا تفصیلی تذکرہ قلم بند کیا جن کا تعلق بحیثیت ''صدر امین بجنور'' اُن واقعات کے دوران براہِ راست یا بالواسطہ اُن کے فرائض اور انگریز حکمرانوں کے ساتھ اُن کے ذاتی روابط سے تھا۔ اِس ضلع میں انگریزوں کے خلاف بغاوت فرو کرنے کے سلسلے میں ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے اُنہوں نے جو کردار ادا کیا، اِس کتاب میں اُن کی تفصیلات بڑے فخر سے بیان کی گئی ہیں۔

اِسی سلسلے کی ایک کڑی ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' یا ''رسالہ خیر خواہ مسلمانان'' کے نام سے اُن کے مرتب کردہ تین رسائل ہیں جن میں انہوں نے مسلمانوں کی وکالت کرتے ہوئے

بحثیت قوم مجموعی طور پر بغاوت میں اُن کے ملوّث ہونے کی پر زور تردید کی اور اس کے ثبوت میں اُن متعدد ''خیر خواہ'' مسلمانوں کا ذکر بالتفصیل سرکاری اسناد کے ساتھ کیا جنہوں نے انگریز آقاؤں کی حمایت میں جاں نثارانہ خدمات انجام دیں۔ اِسی موضوع پر اُن کے دلی جذبات کا ایک عکس اُن کے پمفلٹ ''شکریہ'' کی اُس دعا میں بھی ملتا ہے جو اُنہوں نے مرادآباد کے ایک جلسہ عام میں اللہ تعالیٰ سے انگریز حکمرانوں کی سدا سلامتی مانگنے کے لئے بڑے پر درد لہجے میں کی۔

آج ہم جن واقعات کو ''جنگِ آزادی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں سرسید اُن کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ سرکشی، غدر، ہنگامہ، فساد، ہنگامہ قتل و غارت، ہنگامہ مفسدی و بے ایمانی و بے رحمی، ایامِ مفسدہ یا مکروہ زمانہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو افراد ہمارے لئے مجاہدینِ حُریت کا درجہ رکھتے ہیں وہ اُن کی نظروں میں مفسد، نمک حرام، غنیم، دشمن، غادر، کافر، بے ایمان، بدذات، پاجی، بداطوار، شراب خور، تماش بین وغیرہ تھے۔ سرسید کی متذکرہ بالا تصانیف میں یہ تمام الفاظ موجود ہیں۔ جنگِ آزادی کے رہنماؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنے جذبات کو مصلحتاً بھی چھپانا گوارا نہیں کرتے۔ اپنی تصنیف ''سرکشی ضلع بجنور'' میں، جسے وہ تاریخ کی کتاب کہتے ہیں، انہوں نے نواب محمود خاں کو جابجا ''نامحمود خاں'' لکھ کر اُس سے اپنی شدّتِ نفرت کا برملا اظہار کیا ہے۔ احمد اللہ خاں کو بدذات اور بدنیتی اور فساد کا پتلا تحریر کرتے ہیں۔ ماڑے خاں کو امام بخش عرف ماڑے بدمعاش، قدیمی اور پکا بدمعاش، حرامزادہ، بے رحم، مفسد وغیرہ کہنے سے نہیں چوکتے۔ عنایت رسول کا ذکر نامی باغی اور مشہور حرام زادہ کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ نواب خان بہادر خاں کو بے ایمان اور نمک حرام ہونے کا ملزم گردانتے ہیں۔ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' میں انہوں نے بہادر خاں کو بدمعاشوں کا سرکردہ اور سردار کا خطاب عطا کیا ہے۔ مولوی وہاج الدین کو منو نامی بدمعاش کا لقب دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو لکھتے ہوئے بخت خاں کو باغیوں کا سرغنہ بتلاتے ہیں۔ ان رہنماؤں کے تمام اوصاف کا ذکر معکوس انداز میں کرتے ہیں اور اُن کا خاندانی پس منظر بیان کرتے ہوئے بعض اوقات ان کے آباؤ اجداد کو ذلتوں کے گڑھے کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا ڈالتے ہیں۔ تعلیم یافتہ شخصیتوں کو

کوراان پڑھ ظاہر کرتے ہیں اور حُریت کی جدوجہد میں سزا پانے والوں کا قصور بتاتے ہوئے اُن کے خلاف جرائم سنگین کے مرتکب ہونے کے الفاظ اس طرح ادا کرتے ہیں جس سے دوسروں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ وہ لوگ گویا اخلاقی جرائم میں ملوث رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعات پر ایک فقرے میں سرسید کا یہ جامع تبصرہ اُن کے پورے ذہن کی عکاسی کرتا ہے:

''یہ ہنگامۂ فساد جو پیش آیا صرف ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال تھا۔''[۱]

اس کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ ہندوستانی فوج کو یوں اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

''وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتے تھے۔ فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تمام ہندوستان کی فتوحات صرف اپنی تلوار کے زور سے جانتے تھے۔ اُن کا یہ قول تھا کہ برما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر دیا ہے۔ علی الخصوص پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اب اُن کے غرور نے یہاں تک نوبت پہنچائی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر تکرار کرنے پر مستعد تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فوج کے غرور اور تکبر کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ کچھ عجب نہ تھا کہ وہ کوچ اور مقام پر بھی تکرار نہ کرتی۔ ایسے وقت میں کہ جب فوج کا یہ حال تھا اور ان کے سر غرور و تکبر سے بھرے ہوئے تھے اور دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے، خواہ مخواہ سرکار کو ماننا پڑے گا اُن کو نئے کارتوس دئے گئے۔''[۲]

ان کارتوسوں میں سوٴر کی چربی کے مفروضہ کا باغیانہ سرگرمیوں سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ اُس میں یقیناً سوٴر کی چربی تھی تو اُس کے کاٹنے سے بھی مسلمانوں کا دین نہیں جاتا۔ صرف اتنی بات تھی کہ گناہ ہوتا، سو وہ گناہ شرعاً بہت درجے کم تھا اُن گناہوں سے جو اِس غدر میں

بدذات مفسدوں نے کئے۔'' [۳]

غرضیکہ سرسید کسی نہ کسی زاویے سے ہندوستانیوں کو بے جا فساد کا ملزم گردانتے کی توجیہہ پیش کرنے میں اپنی جانبدارانہ صلاحیتوں کو بخوبی استعمال میں لاتے ہیں۔

ہمارے دانشور سرسید کی عوامی خدمات کا ذکر ہمیشہ ۱۸۵۷ء کے فوری بعد کے دور سے شروع کرتے ہیں اور خاص کر اِس اہم سال کے سلسلے میں اُن کی خصوصی اہمیت کی حامل عملی سرگرمیوں پر خاص مقاصد کے تحت پردہ پڑا رہنے دیا جاتا ہے۔ حقائق کو چھپانا بھی دراصل تاریخ کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔ مجبوری کی صورت میں واقعات کو اِس طرح پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے قاری کو بالکل اُلٹ تاثر حاصل ہو۔ گمراہ کن تاویلیں گھڑی جاتی ہیں اور الفاظ کے ہیر پھیر سے منفی کردار کو مثبت کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے حالانکہ جس شخصیت کی حمایت میں یہ سب جعل سازی کی جاتی ہے اُس کا اپنا بیان ہے کہ ''طرفداری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی کی بات ہے کہ اُس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے اور اُس کا وبال قیامت تک مصنّف کی گردن پر ہوتا ہے''۔ [۴]

پڑھا لکھا کہلانے کے باوجود ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ طرفداری کی حامل متذکرہ تحریروں کے اس قدر زیرِ اثر آ چکا ہے کہ وہ خود اگلی نسل کو اپنا غلط تاثر منتقل کر رہا ہے۔ ایسے حالات میں اگر صحیح واقعات اپنے الفاظ میں پیش کئے جائیں تو متاثرہ حلقے انہیں قبول نہیں کرتے، لہٰذا مجبوری ہے کہ سنہ ستاون کے دوران سرسید نے جو ''تاریخی خدمات'' سرانجام دیں اُن کا ذکر اُنہی کے الفاظ میں پیش کیا جائے تاکہ صحیح واقعات کے بیان میں کسی آمیزش کا شائبہ نہ رہے۔

سرسید ۱۸۵۷ء کے واقعات سے براہِ راست متاثر ہوئے لہٰذا اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہوئے اِن میں عملی طور پر حصہ لیا اور اپنے آقاؤں کے ساتھ وفاداری اور خیرخواہی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اپنے اس کردار کا ذکر کرتے ہوئے وہ بیان کرتے ہیں:

> ''کم بخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے۔
> اُس زمانہ میں میں بجنور میں تھا۔ جو مصیبت کہ وہاں کے موجود حکام
> انگریزی اور عیسائیوں کے زن و مرد اور بچوں پر پڑی، صرف اس خیال

سے کہ انسانیت سے بعید ہے کہ ہم مصیبت کے وقت اُن کا ساتھ نہ دیں، میں نے اُن کا ساتھ دیا۔'' [۵]

اپنے ایک خط میں وہ اِس کردار پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڑا شکر خدا کا ہے کہ اِس ناگہانی آفت میں، جو ہندوستان میں ہوئی، فدوی بہت نیک نام اور سرکار دولت مدار انگریزی کا طرفدار اور خیر خواہ رہا۔'' [۶]

یہی نہیں بلکہ وہ اِس کے جواز میں مذہبی سند بھی پیش کرتے ہیں:

''مجھ سے اگر کچھ اچھی خدمت یا وفاداری گورنمنٹ کی ہوئی تو وہ بالکل میں نے اپنے مذہب کی پیروی کی..... میں نے جو کچھ کیا اپنے خدا و رسولؐ کی اطاعت کی۔'' [۷]

سرسید نے شروع سے لے کر آخر تک اپنے قول و فعل سے ثابت کر دکھایا کہ وہ انگریز حکمرانوں کے حق میں انتہائی مخلص تھے۔ اپنے تاثرات اور کارگزاریاں بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جب غدر ہوا میں بجنور میں صدر امین تھا کہ دفعۃً سرکشی میرٹھ کی خبر بجنور میں پہنچی۔ اوّل تو ہم نے جھوٹ جانا مگر جب یقین ہوا تو اُسی وقت سے میں نے اپنی گورنمنٹ کی خیرخواہی اور سرکار کی وفاداری پر چست کمر باندھی۔ ہر حال اور ہر امر میں مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور کے شریک رہا، یہاں تک کہ ہم نے اپنے مکان پر رہنا موقوف کر دیا۔ دن رات صاحب کی کوٹھی پر حاضر رہتا تھا اور رات کو کوٹھی کا پہرہ دینا اور حکام کی اور میم صاحبہ اور بچوں کی حفاظتِ جان کا خاص اپنے ذمہ اہتمام لیا۔ ہم کو یاد نہیں ہے کہ دن رات میں کسی وقت ہمارے بدن پر سے ہتھیار اُترا ہو۔'' [۸]

سرسید کے عظیم معتقد اور اُن کے سوانح نگار حالی لکھتے ہیں:

''......گو کہ سرسید کو باعتبار عہدہ کے اُن سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شیکسپیئر اور مسز شیکسپیئر سے اُن کی بہت راہ و رسم تھی۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شیکسپیئر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر اُن کی تشفی کی اور کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔'' [9]

جاں نثاری کے اِس جذبے کے معاملے میں سرسید کی دلی کیفیت کیا تھی، یہ اُنہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''ہم اپنے دل کا حال بیان کرتے ہیں کہ جناب مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر دام اقبالہٗ اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر دام اقبالہٗ جو جو اخلاق اور عنایت ہمارے حال پر فرماتے تھے اُن اخلاقوں اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت اِن صاحبوں کی ڈال دی تھی کہ اِن صاحبوں کی خدمت گزاری میں ہم اپنی جان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ بے مبالغہ میں اپنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہوں کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا وہ بُرا ہی بُرا دکھائی دیتا تھا اور جب اِس وہم کا اثر دل پر پہنچتا تھا تو دل سے ایک محبت کا بہت بڑا شعلہ نکلتا تھا اور وہ ان صاحبوں کو گھیر لیتا تھا اور ہمارا دلی ارادہ یہ تھا کہ خدانخواستہ اگر کوئی برا وقت آئے تو اول ہم پروانہ کی طرف قربان ہو جائیں، پھر جو کچھ ہو سو ہو۔'' [10]

انہوں نے اپنے اس دلی جذبے کا عملی مظاہرہ متعدد موقعوں پر کیا۔ لکھتے ہیں:

''جب کہ جیل خانہ ٹوٹا اور نگینہ تک سفر مینا کی سرکش پلٹن روڑکی سے آ گئی اور ہم نے کنوئیں میں خزانہ ڈالا، بہت بُرا سخت وقت تھا اور جب

مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر نے قیدیوں پر تن تنہا حملہ کیا تو اُس وقت سوائے میرے اور میرے ساتھی مسلمان دو افسر اور کے اور کوئی شخص صاحب ممدوح کے ساتھ نہ تھا۔ مگر میری دانست میں دو وقتوں سے زیادہ سخت وقت کوئی ہم پر نہیں گزرا...... پہلا وقت وہ تھا جب دفعتہً ۲۹ نمبر کی کمپنی سہارن پور سے بجنور میں آ گئی۔ میں اُس وقت صاحب ممدوح کے پاس نہ تھا۔ دفعتہً میں نے سنا کہ فوج باغی آ گئی اور صاحب کے بنگلہ پر چڑھ گئی۔ میں نے یقین جان لیا کہ سب صاحبوں کا کام تمام ہو گیا مگر میں نے نہایت بری بات سمجھی کہ میں اس حادثہ سے الگ رہوں۔ میں ہتھیار سنبھال کر روانہ ہوا اور میرے ساتھ جو ایک لڑکا صغیر سن تھا، میں نے اپنے آدمی کو وصیت کی، میں تو مرنے جاتا ہوں مگر جب تو میرے مرنے کی خبر سن لے تب اِس لڑکے کو کس امن کی جگہ پہنچا دیجیو۔ مگر ہماری خوش نصیبی اور نیک نیتی کا یہ پھل ہوا کہ اِس آفت سے ہم بھی اور ہمارے حکام بھی سب محفوظ رہے مگر مجھ کو اُن کے ساتھ اپنی جان دینے میں کچھ دریغ نہ تھا۔'' [۱۱]

اِس آفت سے محفوظ رہنے کا سبب سر سید یہ بتاتے ہیں کہ جب وہ ''صاحب ممدوح'' کے ہاں پہنچے تو اُنہیں معلوم ہوا کہ وہ پلٹن دراصل ''بطورِ بدلی مراد آباد جاتی ہے''۔ [۱۲]

''برے سخت وقت'' میں سفر مینا کی جس ''سرکش'' پلٹن کا ذکر سر سید نے کیا ہے اُس کے متعلق اپنے خدشات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہم کو کچھ اُمید نہ تھی کہ آج کی رات خیر سے گزرے گی اور بڑا اندیشہ ہم کو حکام انگریزی اور جناب میم صاحبہ کا تھا کیونکہ یہ نمک حرام کم بخت تلنگے خاص حکام انگریزی کے نقصان پہنچانے کے درپے تھے...... ہم جب اُس رات کوٹھی پر آن کر بیٹھے ہیں تو اِس ارادے سے نہیں آئے تھے کہ ہم زندہ یہاں سے پھر اپنے گھر پر آئیں گے۔'' [۱۳]

دوسرے خاص سخت وقت کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

''دوسرا زمانہ وہ ہے کہ جب جون کی آٹھویں رات کو باغیوں نے حکام یورپین کے قتل کا ارادہ کیا اور مجھ کو خبر ملی اور فی الفور میں نے مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کو اطلاع دی۔ وہ رات جس مصیبت سے گزری ہم سے اُس کا بیان نہیں ہوسکتا۔'' [۱۴]

یہ دوسرا واقعہ نواب محمود خاں کے پٹھان سپاہیوں سے متعلق ہے۔ سرسید نے ذاتی حکمتِ عملی سے کام لے کر نواب کو انگریزوں کی بجنور سے بحفاظت روانگی پر قائل کرلیا اور اُن کی غیر موجودگی کے عرصہ کے لئے ضلع تحریری طور پر نواب کے سپرد کر دیا گیا جس کا مضمون خود سرسید نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد سرسید نے بھی وہاں سے نکل جانے کی کوشش کی مگر نواب نے انہیں بلوا کر حسبِ سابق اپنے عہدے پر کام کرتے رہنے کی ہدایت کی۔ سرسید ذہنی طور پر نواب کو قبول نہ کر سکے اور اُس کے انتظام کو غیر متوازن کرنے کے لئے اُن کی تین رکنی خفیہ کمیٹی نے عدمِ تعاون کا منصوبہ بنایا جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جب کہ نواب نے ہم کو کہا کہ تم سب اپنا اپنا کام کرو، اُس وقت میں نے اور سید تراب علی تحصیل دار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب تک کہ باہم کمیٹی کے اُس کی صلاح نہ ہولے۔ چنانچہ اُسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھہری کہ میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور کو جو ضروری حکم نواب کا پہنچے اُس کو لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں اور باقی مال گزاری، بجز اس قدر روپیہ کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل وتھانہ تقسیم ہو جائے، اور کچھ وصول نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بخشی رام تحویل دار کی معرفت کہ وہ بھی خیر خواہِ سرکار اور ہمارا ہم راز تھا، جو

مال گزار آیا اُس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے...... اور نسبت اجرائے کار دیوانی یہ رائے ٹھہری کہ جب تک ہو سکے، میں صدر امین بموجب آئین سرکارِ دولت مدارِ انگریزی کام کرتا رہوں اور کسی طرح کا تعلق نواب سے اِس کام کا نہ رکھوں، چنانچہ مجھ صدر امین نے ایسا ہی کیا اور جو روبکاریاں اور رپورٹیں قابل ارسال بحضور جناب صاحب جج بہادر تھیں اُن میں علی الاعلان کچہری میں بھی حکم تحریر ہوتا رہا کہ بحضور جناب صاحب جج بہادر بھیجی جائیں۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ عوام یہ سمجھتے تھے کہ حکام انگریزی کا تسلّط بدستور ہے، البتہ نواب کو یہ امر بہت ناگوار تھا اور ایسی باتوں سے اُس کی دشمنی ہمارے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی تھی مگر ہم کو توقع تھی کہ ہمارے حکام بہت جلد پھر ضلع میں تشریف لاتے ہیں۔'' [15]

نواب نے سرسید کو تخلیہ میں بلا کر انہیں اپنے ساتھ شریک ہونے کے عوض جاگیر کی پیشکش کی مگر وہ نہ مانے بلکہ بڑی دلیری کے ساتھ اُس کے منہ پر کہا کہ ''اگر تمہارا ارادہ ملک گیری اور انگریزوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا ہے تو میں تمہارے شریک نہیں ہوں...... خدا کی قسم نواب صاحب، میں صرف تمہاری خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ تم اِس ارادہ کو دل سے نکال دو، حکام انگریزی کی عمل داری کبھی نہیں جائے گی...... اگر تم مجھ کو انتظامِ ملک میں شریک کیا چاہتے ہو تو جناب صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت منگا لو اور یہ اقرار کر لو کہ کوئی کام نہیں کرنے کے جب تک پہلے اُس کی منظوری جناب صاحب کلکٹر بہادر سے حاصل نہ کر لیں''۔ [16]

سرسید اپنے منصوبے پر عمل کرتے رہے اور انگریزوں کو نواب کی خبریں پہنچاتے رہے۔ منیر خاں جہادی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی اس ''خبر نویسی'' کا برملا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور پر یہ

الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور اُن کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں اس لئے اُن کا قتل واجب ہے، اور در حقیقت ہماری ''خفیہ خط و کتابت'' جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی۔'' ۱۷

اُدھر ضلع کے ہندو چودھریوں نے سر اُٹھایا اور اُن کی نواب کی سپاہ کے ساتھ لڑائیاں اور جھڑپیں ہونے لگیں۔ بالآخر انہوں نے بجنور پر لشکر کشی کر دی۔ نواب اور اُس کے ساتھی بھاگ کر نجیب آباد چلے گئے۔ عین لڑائی کے وقت اور اُس کے بعد سرسید اور اُن کے ساتھی جس کیفیت میں مبتلا تھے، وہ ملاحظہ فرمائیے:

''جبکہ بجنور میں لڑائی ہوئی تو ڈپٹی کلکٹر صاحب ہلدور میں تھے اور ہماری کمیٹی کے تینوں ممبر یعنی، میں اور سید تراب علی تحصیل دار بجنور اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر، بجنور میں اپنے اپنے مکان بند کئے بیٹھے تھے اور جو صدمہ ہمارے دل پر تھا اُس کا بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے خیال میں بھی نواب کی شکست ہونی نہیں آتی تھی اور خوب ہم کو یقین تھا کہ نواب ہم تینوں کی جان نہیں بخشنے کا کیونکہ سچا جرم طرفداری اور خیر خواہی سرکار اور خفیہ خط و کتابت کا، جو اُس نے ہماری طرف لگا رکھا تھا، اُس کے سوا یہ بڑا شبہ اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ چودھریوں کا لڑنا، علی الخصوص چودھریانِ بجنور کا مقابلہ پیش آنا، یہ ہم لوگوں کے اغوا سے ہوا حالانکہ ہم اس اخیر الزام سے بالکل بری اور بے خبر تھے۔ جبکہ نواب کی شکست ہوئی، ہم نے اپنی زندگی دوبارہ سمجھی اور یہ بات چاہی کہ گنگا پار میرٹھ چلے آئیں کیونکہ جو ظالم ہمارے سدِ راہ ہو رہا تھا اور ہم کو بجنور سے نہیں نکلنے دیتا تھا، نہ رہا تھا...... ہم نے چودھریان بجنور سے چند روز تک نہایت عاجزی سے التجا کی مگر انہوں

نے ہم کو نہ نکلنے دیا...... اُن کو یہ خیال ہوا کہ اُن کے چلے جانے سے انتظام ضلع کا نہ ہو سکے گا اور رعایا کے دل ٹوٹ جائیں گے مگر ہم کو یہاں کے رہنے سے کمال رنج تھا کہ ہم نہایت بے بس اور بے کس تھے اور ہمیشہ ہم کو یقین تھا کہ اب نواب بجنور چھین لے گا اور ہم پکڑے اور مارے جائیں گے۔'' [18]

نواب اور اُس کے ساتھیوں نے اپنی جمعیت کو مجتمع کرنا شروع کر دیا۔ چودھری گھبرائے۔ انہوں نے نواب کے خوف• سے انگریزوں سے مدد چاہی۔ سرسید کی بھی یہی کیفیت تھی اور انہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ چودھریوں سے واپس آنے کا بہانہ بنا کر بجنور سے ہلدور پہنچے تا کہ گنگا پار کر جائیں۔ اُدھر انگریزوں نے چودھریوں کی درخواست قبول کی، ضلع میں تھوڑی سی فوج بھیجنے کا وعدہ کیا اور اُس وقت تک کے لئے سرسید اور رحمت خاں کو ضلع کے ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ سرسید لکھتے ہیں:

''جب یہ حکم ہمارے نام پہنچا تو ہم نے اُس کی اطاعت کرنی اپنی کمال عزت سمجھی اور میں اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر ہلدور سے بجنور میں آئے اور انتظامِ ضلع اپنے ہاتھ میں لئے اور اشتہارات عملداری سرکارِ دولت مدار کے جاری کئے اور تمام ضلع میں سرکار کمپنی انگریز بہادر کے نام سے منادی پٹوائی۔'' [19]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''جب ضلع ہمارے سپرد ہوا تو میری یہ رائے تھی کہ پرانے لفظ منادی کے یعنی ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی صاحب بہادر کا'' بدلے جائیں اور بجائے'' ملک بادشاہ کے'' پکارا جائے کہ ''ملک ملکہ معظمہ وکٹوریا شاہِ لندن کا'' کیونکہ منادی میں ایسے الفاظ چاہئیں کہ جن سے عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھے کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے اور ہم کس کی رعیت ہیں؟ لیکن بلا اجازت حکام

صرف اپنی رائے سے اِس دستورِ قدیم کو بدلنا مناسب نہ جانا اور اس باب میں ایک خاص رائے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی۔'' [۲۰]

اس اثنا میں مختلف مقامات پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوں ریز جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ نگینہ میں مسلمانوں کا بار بار قتل عام کیا گیا اور اُن کے مکانات نذرِ آتش کر دئے گئے۔ اپنے مہربان ہندو چودھریوں کی نگینہ پر چڑھائی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر سر سید خود لکھتے ہیں:

''نگینہ میں مشہور ہوا کہ چودھری بدھ سنگھ ہزاروں آدمی اور توپ لے کر نگینہ پر چڑھ آئے۔ اُس وقت رات میں مسلمانانِ نگینہ نے بھاگنا چاہا اور پیادہ پا عورتوں اور بچوں کو لے کر چلے اور راستہ میں لٹے اور عورتیں زخمی ہوئیں اور اچھے اچھے اشرافوں کی بڑی بے عزتی ہوئی اور بشنوئی اِن سب خرابیوں کے، جو مسلمانوں پر اور عورتوں پر ہوئیں، سر منشا اور سرغنہ اور باعث تھے۔ سید تراب علی تحصیل دار ہم سے کہتے تھے کہ اُس وقت جو مصیبت اُن کی اور مولوی محمد علی اور اور بھلے مانس مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں پر گزری تھی اور جو جو بے عزتیاں بھلے مانسوں کی ہوئی ہیں، کہنے کے لائق نہیں ہیں۔'' [۲۱]

اِن لڑائیوں کے دوران نواب کی طرف سے احمد اللہ خاں بجنور پر چڑھ آیا۔ اُس وقت کی افراتفری کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

''مجھ صدر امین اور ڈپٹی صاحب نے مکان تحصیل کو بند کر کے اور پانچ سات آدمی، جو ہمارے ساتھ تھے، اُن کو لے کر اور ہتھیار بندوق سے آراستہ ہو کر اِس دھیان میں ہو بیٹھے کہ اب احمد اللہ خاں بجنور میں آتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا ہم اُس سے لڑیں گے، آخر کار مارے جائیں گے اور جس قدر خطوط اور کاغذات از طرف حکام انگریزی در باب انتظامِ ضلع ہمارے پاس آئے تھے اور جتنی رپورٹیں کہ ہم نے یہاں

سے روانہ کی تھیں اور اُن کی نقلیں ہمارے پاس موجود تھیں، اُن سب کو ہم نے بنظرِ دُور اندیشی جلا دیا۔''[۲۲]

چودھریوں نے ہلدور کو بھاگ جانے کا پروگرام بنایا۔ سرسید کو بھی یہی رائے دی گئی لہٰذا وہ بھی رات کے آخری حصے میں وہاں سے چل کر صبح ہلدور میں چودھریوں سے جا ملے مگر وہاں بھی انہیں امن نہ ملا۔ احمد اللہ خاں نے ہلدور پر بھی دھاوا بول دیا۔ چاروں طرف خندق کھدی ہوئی تھی۔ لڑائی جاری تھی کہ علاقے کے چاروں کونوں میں آگ بھڑک اُٹھی اور آمد و رفت کے راستے بند ہو گئے۔ لہٰذا احمد اللہ خاں دوسری طرف چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد چودھریوں کے آدمیوں کی تین ہزار جمعیت اکٹھی ہوئی، مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور اُن کے گھر پھونک ڈالے گئے۔ اِس ظلم پر بھی سرسید کا دل نہیں پسیجتا بلکہ اِس کے برعکس مسلمانوں ہی پر فساد کی بنیاد ڈالنے کا الزام لگا کر انہیں غیر مہذب گالیاں دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''چودھری صاحبوں نے تمام راستہ ہلدور کے گھیر لئے اور جس قدر مسلمان حلوائی اور چھیپی اور کمہار وغیرہ ہلدور میں دستیاب ہوئے، سب کو برابر قتل کر دیا اور بہت سی عورتیں گرفتار ہو کر کوٹھے میں قید کی گئیں اور کچھ عورتیں بھی ''اتفاقیہ'' ماری گئیں اور کچھ مرد اور کچھ عورتیں اور بچے زخمی بھاگ کر چاند پور پہنچے۔ جو حلوائی اور چھیپی مفسد اور حرام زادہ تھے اور ''غالباً'' انہوں نے بھی اُس روز ہلدور میں فساد کیا تھا اور آگ لگائی تھی، اُسی روز مع اپنے اہل و عیال کے احمد اللہ خاں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے تئیں بے قصور سمجھ کر ہلدور میں رہ گئے تھے۔ غرض کہ شام تک ان لوگوں کا برابر قتل رہا اور جس قدر گھر مسلمانوں کے وہاں تھے وہ سب جلا دئے گئے اور اُن کے ساتھ ہندوؤں کے بھی بہت سے گھر، جو بیچ میں آ گئے، جل گئے اور ہلدور کا یہ حال ہو گیا کہ بجز دو پکی حویلیوں کے کوئی گھر جلنے اور خراب ہونے اور لٹنے سے باقی نہیں رہا۔ پھونس کا نام ہلدور میں سے جاتا رہا، یہاں تک

کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھونس کا تنکا اپنا گھونسلا بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا۔'' [۲۳]

سرسید اس دوران ہندو چودھریوں کے مہمان کے طور پر مکان کے اندر بیٹھے سفاکی کا یہ مظاہرہ دیکھتے رہے مگر اپنے معزز چودھری ''صاحبان'' کو مسلمانوں کے خون سے اپنی پیاس نہ بجھانے کی رائے تک بھی نہ دے سکے۔ انہیں تو خود اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں:

''ہندوؤں کو مسلمانوں سے اِس قدر عداوت ہو گئی کہ چند آدمی جو اتفاقیہ ہلدور میں وارد تھے، وہ بھی مارے گئے۔ گنوار بخوبی پکار پکار کر ہم لوگوں اور ڈپٹی صاحب کی نسبت صاف صاف کہتے تھے کہ گویہ لوگ چودھریوں سے ملے ہوئے ہیں مگر مسلمان ہیں، ان کو بھی مار ڈالنا چاہیے۔ مگر چودھری رندھیر سنگھ نے ہماری بہت حفاظت کی اور کہلا بھیجا کہ دروازہ مضبوط کر کے اندر بیٹھے رہو اور کسی اپنے نوکر کو بھی باہر نہ نکلنے دو، ایسا نہ ہو کوئی مار ڈالے۔ اِس سبب سے تین روز تک ہم کو ہلدور میں پانی اور کھانے کی بہت تکلیف رہی۔'' [۲۴]

اس کے بعد سرسید کے فرار کی الم ناک داستان شروع ہوتی ہے جو مختصراً اُنہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''جب یہ حال ہوا تو پھر ہم نے اپنا قیام ہلدور میں بھی مناسب نہ جانا اور تمام ضلع میں کوئی اور ایسی جگہ بھی نہ تھی جہاں ہم رہ سکتے۔ اِس مجبوری سے ضلع کا چھوڑنا ضرور پڑا۔ انتیسویں تاریخ کا دن جس طرح ہو سکا ہم نے ہلدور میں بسر کیا۔ گیارہ بجے رات کے ہم پیادہ پا وہاں سے نکلے اور نہایت مشکل اور تباہی سے راستہ کاٹا۔ صبح ہوتے ہم لوگ مع ڈپٹی صاحب اور متھر اداس اور بانکے رائے خزانچی کے قریب موضع پچنیاں کے پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ پچنیاں میں بہت لوگ ہمارے لُوٹنے اور مارنے کو جمع ہیں اس لئے اس راہ کو چھوڑنا ضرور پڑا اور پلانہ کا راستہ

اختیار کیا۔ جب موضع پلانہ کی سرحد میں پہنچے، دفعۃً دو ہزار گنوار مسلح ہم پر دوڑے اور ہمارے لُوٹنے اور قتل کا ارادہ کیا۔ مسمی بخشی سنگھ پدھان موضع پلانہ نے مجھ کو اور ڈپٹی صاحب کو پہچانا اور اُن گنواروں کو روکا اور خود ساتھ ہو کر بحفاظت تمام اپنے گاؤں کی سرحد سے نکال دیا۔ جبکہ ہم موضع گھیر کی میں پہنچے تو وہاں کے زمینداروں نے ہماری بہت خاطر کی اور ہم کو پانی اور دودھ پلایا اور ہر طرح سے ہماری اطاعت کی اور چند آدمی ساتھ ہوئے تاکہ چاند پور تک پہنچا دیں۔ چاند پور میں اِس سے زیادہ مصیبت ہماری قسمت میں لکھی تھی کہ جب ہم قریب دروازہ چاند پور کے پہنچے اور بدمعاشان مسلمانانِ چاند پور کو ہمارے آنے کی خبر ہوئی، دفعۃً محلہ بتیا پارہ میں ڈھول ہوا اور صدہا آدمی تلوار اور گنڈاسہ اور طمنچہ اور بندوق لے کر ہم پر چڑھ آئے۔" [۲۵]

آگے چل کر وہ اِس کا سبب یوں بیان کرتے ہیں:

"چاند پور میں جو ہم پر آفت پڑی گو اصلی منشا اُس کا یہی تھا کہ ہم سرکار کے خیر خواہ اور طرف دار تھے اور اعلانیہ سرکار کی طرفداری کر کے انتظام ضلع کا اُٹھالیا تھا لیکن اِس قدر عام بلوے کے ہمارے پر ہونے کا یہ سبب تھا اور سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ چودھریوں سے سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو مروا دیا اور لوگوں کی جورو بیٹی کی بے عزتی کروائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا، اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے۔ اور ہلدور سے حلوائیان اور چھیپیوں کے زخمی مرد اور عورت اور بچے جو بچ کر بھاگے تھے، وہ تھوڑی دیر پہلے ہم سے چاند پور میں پہنچ چکے تھے۔ اُن کا حال دیکھ کر زیادہ تر لوگ ناراض ہو رہے تھے کہ ہم بے گناہ دفعۃً وہاں جا پہنچے۔" [۲۶]

داستان کو جاری رکھتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

''ہمارے مارے جانے میں کچھ شبہ باقی نہ تھا مگر فی الفور میر صادق علی رئیس چاند پور ہماری مدد کو پہنچے اور اپنے رشتہ داروں اور ملازمان کو ساتھ لے کر اُن مفسدوں کو روکا۔ اِس عرصہ میں اور بہت سے آدمی شہر کے ہماری اعانت کو آئے اور اُن بدذاتوں کے ہاتھ سے ہم کو بچایا اور میر صادق علی ہم کو اپنے مکان پر لے گئے اور وہاں امن دیا۔ دوسرے روز خود ساتھ ہو کر موضع چچولہ تک پہنچا دیا۔'' [۲۷]

واضح ہو کہ یہ میر صادق علی وہی شخصیت ہیں جن کا تعلقہ بعد میں ''اِس جرم میں کہ اُن کی عرضی بادشاہِ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا'' [۲۸] اور جب سرسید کو اُن کی خدمات کے عوض یہ تعلقہ دینا تجویز کیا گیا تو انہوں نے اِس کے لینے سے انکار کیا۔

بالآخر سرسید کے مصائب کا آخری مرحلہ طے ہوا۔ لکھتے ہیں:

''وہاں سے ہم بچھراؤں گئے اور وہاں سے عرضی مفصل سرگزشت کی بحضورِ حکام لکھی اور چند روز بسبب بیماری کے مقام کر کے ڈپٹی صاحب براہِ خورجہ، بعد پہنچانے اپنے اہل و عیال کے، اور میں صدر امین سید ھا بمقام میرٹھ بحضورِ حکامِ عالی مقام حاضر ہوئے۔'' [۲۹]

حالی لکھتے ہیں ''جس وقت وہ (سرسید) میرٹھ میں پہنچے ہیں اُن کے پاس چھ پیسے اور اُس پھٹے ہوئے کُرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے، اور کچھ نہ تھا''۔ [۳۰]

نمک حلال نوکر کے لئے آقا کی عزت افزائی کس قدر مسرت و شادمانی اور فخر کا باعث ہوتی ہے، اس کا احساس وہی کر سکتا ہے جس پر یہ کیفیت گزر چکی ہو اور اُسے بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اس موقع پر سرسید کے ذاتی محسوسات کیا تھے، ملاحظہ فرمائیے:

''میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں، اور پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا

ہوں، اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو میں کیوں نہ اُس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اُس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اِس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اُٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے، جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے، سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ، اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اُسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اِس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے۔ میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدردانی کی۔ خدا اُن کو سلامت رکھے۔ آمین“ [۳۱]

انگریز ”بہادر“ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اُن کی ساختہ سرسید کی مذکورہ تصویر آج ہمیں

سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب اور ذرائع ابلاغ میں بڑی آب و تاب سے جگمگاتی نظر آتی ہے جس کی چکاچوند ہمارے دانشوروں کے ذریعے آئندہ کئی نسلوں تک منتقل ہوتی محسوس ہوتی ہے۔

جب ذرا صحت ہوئی تو سرسید میرٹھ سے والدہ کا حال دریافت کرنے کے لئے دہلی گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اُن کے آقا انگریز بہادر کی فوج کے سپاہی دہلی کی ''فتح'' کی خوشی میں آٹھ دس روز پیشتر اُن کے گھر کا تمام سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ اُن کی والدہ اپنی نابینا بہن کے ساتھ حویلی چھوڑ کر اپنی ایک خدمتگار لاوارث بڑھیا کی کوٹھڑی میں چلی آئی تھیں۔ تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہ تھا، یہاں تک کہ گھوڑے کے دانے پر بسر تھی۔ وہ دو دن سے مکمل پیاسی تھیں۔ دور و نزدیک پانی میسر نہ تھا۔ سرسید قلعہ میں گئے اور وہاں سے پانی کی صراحی لا کر والدہ کی پیاس بجھائی اور پھر حکامِ قلعہ کی اجازت سے سرکاری ڈاک کی شکرم پر والدہ اور خالہ کو بٹھا کر میرٹھ لے گئے۔[۳۲]

اِسی ''فتح'' کے جنون میں بقولِ سرسید اُن کے بڑے ماموں ''نواب وحید الدین خاں، جو ضعیف ہو گئے تھے، نمازِ عصر پڑھ رہے تھے، کسی سپاہی نے عین نماز کی حالت میں اُن کے گولی ماری اور اُن کا انتقال ہو گیا''۔[۳۳]

جب اپریل ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوج بجنور پر دوبارہ قبضہ کے لئے روانہ ہوئی تو سرسید بھی اُس کے ہمراہ تھے۔ اِس مہم کے دوران اُن کا مشغلہ کیا تھا، اُنہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک محاربہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دشمن بھاگ نکلا اور بجز چند توپوں اور بندوقوں کے فائر کرنے کے اُس سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ خاص آنبہ سوت پر، جو بہت مشکل اور مورچہ کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی اور غنیم نے بہت مدت سے یہاں مورچہ درست کیا تھا، اِس کو بھی چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہاں تک کہ سینکڑوں آدمی جوتیاں اور وردی کے کپڑے اور اپنے ہتھیار پھینک کر بھاگے۔ تمام جنگل اور سڑک پر ہتھیار بکھرے ہوئے تھے اور ہر ہر قدم پر لاش پڑی

تھی۔ میں، جو لشکرِ محارب کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا، قصداً لاشوں کو دیکھتا کہ شاید کوئی شناخت میں آئے مگر کوئی نامی آدمی نہیں مارا گیا، البتہ دو لاشیں تلنگان نمک حرام کی نظر پڑیں اور میری دانست میں تخمیناً تین سو ساڑھے تین سو آدمی ''غنیم'' کا مارا گیا اور سرکار کی طرف بجز ایک آدمی کے اور کسی کا نقصان نہیں ہوا۔'' [۳۴]

بالآخر بجنور پر قبضہ ہوا تو سرسید نے بھی کچہری صدر امین کی کھول دی۔ اس تمام قصے میں انگریزی سرکار کے جن تین مسلمان اہل کاروں نے ''نیک نامی'' حاصل کی اُن کے کارناموں کی تعریف میں الیگزینڈر شیکسپیئر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بجنور نے اپنی چھٹی نمبری ۵۶ مورخہ ۵ جون ۱۸۵۸ء کے ذریعے رابرٹ الیگزینڈر کمشنر روہیل کھنڈ کے نام جو رپورٹ پیش کی اُس کے چیدہ چیدہ نکات ملاحظہ فرمایئے:

''ہم آپ کی خدمت میں بلاتوقف گزارش کرتے ہیں کہ در باب اُن اہل کاران کے جنہوں نے غدر میں عمدہ کام کیے ہیں اور اپنی ناموری حاصل کی...... نقشہ معمولی ارسال کرتے ہیں نسبت رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر ضلع بجنور | رسید احمد خاں صاحب صدر امین اور میر تراب علی صاحب تحصیلدار ضلع بجنور کے اور حالات مفصلہ تحریر کیے جاتے ہیں کہ موید اِس کے ہیں۔'' [۳۵]

''جو صورت اس ضلع کی وقت شروع غدر کے تھی آپ کو بخوبی روشن ہے۔ فوج سرکار یہاں کچھ نہ تھی اِس سبب سے کچھ اندیشہ ایسے امر کا نہ ہوا اور نہ کچھ تدبیر کرنی پڑی۔ صرف دو مرتبہ البتہ اندیشہ ہوا تھا جب چند نفر تلنگے تھوڑے دنوں کے واسطے یہاں آئے تھے۔ بہت ضروری یہ تدبیر تھی کہ بندوبست ضلع کا بدستور قائم رہے اور کسی وجہ کی بدعت اور دنگہ نواب صاحب اور اُن کے لواحقین کی جانب سے ہونے نہ پائے۔ سوا ایسا سامان جس سے یہ تدبیر کامل ہو سکتی اُس وقت بہت مشکل تھا اور

اشد ضرورت تھی کہ خبر معتبر نسبت ارادہ اور حال ہر قسم کے لوگوں کے ہم کو پہنچا کرے۔ چنانچہ ہم نے مدد کے واسطے افسرانِ موصوف سے مشورہ اس امر کا کیا اور ان افسروں نے اُس مصیبت کے وقت میں ایسی عمدہ مدد ہماری کی کہ جس کا بیان مفصل نہیں ہو سکتا۔ ہم کو یقین کامل ہے کہ اگر افسرانِ موصوف ہماری مدد نہ کرتے تو اتنی مدت تک صاحبان انگریز کا اس ضلع میں ٹھہرنا بہت دشوار تھا۔ اور نیز اِنہی تین صاحب سے واسطے تدبیر مناسب کے اُس وقت بھی مشاورت کی گئی تھی جب ضلع کا حال بگڑنے لگا اور معلوم ہوا کہ نواب صاحب مسلح سپاہیوں کو بھرتی کرتے ہیں کیونکہ اُس صورت میں خبرداری بہت ہی لازم تھی اور نیز جس وقت سپاہیان رجمنٹ ۲۹ سہارن پور سے مراد آباد کو اِس ضلع کی راہ سے آئی اور جیل خانہ ٹوٹ گیا اور خزانہ سرکاری کنوئیں میں ڈالنا مناسب معلوم ہوا اور چند تلنگے اس پلٹن کے ہماری مدد کے واسطے بھیجے گئے۔ غرض ان ہر ایک وقت میں یہ تینوں صاحب بہت ہوشیاری اور جواں مردی کر کے ہمارے ساتھ مستعد رہے۔ آخرش جس رات ہم نے کیمپ چھوڑنا مناسب جانا اگر صدر امین صاحب درمیان میں نہ ہوتے تو یقین تھا کہ نواب صاحب اپنے اہل کاران کو بدعت کی اجازت دیتے اور اغلب تھا کہ ہماری جان پر ضرور صدمہ پہنچتا۔" [۳۶]

"جب کہ ہم نے کیمپ چھوڑ دیا تو ان تین صاحبان نے بھی چھوڑ دیا۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب مقام ہلدور کو، جہاں راجپوت رہتے ہیں، تشریف لے گئے اور صدر امین صاحب اور تحصیل دار صاحب نے موضع بسر کٹرہ میں پناہ لی۔ دو صاحب ان میں سے عیالدار بھی تھے، اس سبب سرِ دست ہمارے ساتھ نہ چل سکے تھے بلکہ اُن کا چلنا مناسب بھی نہ تھا اِس واسطے کہ اُن دنوں میں خبر گرم تھی کہ صبح شام میں دلّی فتح ہوتی

ہے۔اور ہم نے اِس ضلع کو نواب صاحب کے سپرد اِس اُمید پر کیا تھا کہ وہ کسی نہج کی حرکت نہ کریں۔غرض اِس صورت میں مناسب بھی تھا کہ حکامِ اہلِ ہند، جو معتمد ہوں، اِس ضلع میں موجود رہیں۔'' [۳۷]

''دِلّی فتح نہ ہوئی تو اِس ضلع کے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور ان افسروں کا وہاں رہنا بھی مشکل ہوا، بلکہ ۲۹ جون کو جب قریب چار سو آدمی جہادی منیر خاں سرگروہ کے ساتھ، واسطے جانے دہلی کے، اس ضلع میں آئے تھے اُس وقت ان صاحبوں کو جان کا بھی خوف تھا۔اور ۱۶راگست تک، جب نواب بجنور بھاگا، تب تک یہ افسر اعلانیہ خیر خواہی سرکار کی نہ کر سکے مگر بہت مشکل کے ساتھ حکامِ ضلع کو خبر دیتے رہے۔کسی وقت میں ان صاحبوں کو اس بات کا وسوسہ نہیں ہوا کہ انجام کار سرکار غالب نہ رہے۔چنانچہ جس وقت ان صاحبوں کو اجازت واسطے انتظامِ ضلع کے ہوئی تھی ڈپٹی صاحب اور صدر امین صاحب فی الفور مستعد اس کام کے ہوئے تھے اور باعانت زمینداران قوم ہنود کے بندوبست کرنا شروع کیا تھا، مگر ۲۳راگست کو چار و ناچار ہلدور کو چلے گئے اور اس قصبہ پر مسلمان چڑھ آئے۔اور اگر چہ راجپوت اور دیگر قومِ ہنود، جو خیر خواہ سرکاری تھے، اُن سے بمقابلہ پیش آئے مگر مسلمان فتحیاب ہوئے۔'' [۳۸]

''جب یہ مصیبت گزری تو ڈپٹی صاحب اور صدر امین صاحب نے مع دیگر اشخاص کے بمشکل تمام چاند پور میں پناہ لی مگر وہاں بھی نہ ٹھہر سکے، کس واسطے کہ باغی مسلمان اُن سے بباعث خیر خواہی، سرکار کے بہت نفرت رکھتے تھے۔اِس سبب سے صدہا مصیبت کے ساتھ دریا عبور کر کے ڈپٹی صاحب تو خورجہ اپنے وطن کو اور صدر امین صاحب میرٹھ کو تشریف لے گئے۔'' [۳۹]

''غرض ان تینوں صاحب نے سرکار کی بہت ہی خیرخواہی کی۔ اگر ہم ان میں سے کسی کی زیادہ تر توصیف کریں تو نسبت سید احمد خاں صاحب کی ہی کر سکتے ہیں، کس واسطے کہ یہ صاحب بہت دانا ہیں، اِن کی خیرخواہی ایسی جاں فشانی سے ہوئی ہے کہ اِس سے زیادہ ہرگز ممکن نہیں۔ اور ہم کو یقین کامل ہے کہ قدر اور منزلت ان کی حکام کی نظر میں اس قدر ہے کہ بلحاظ خیرخواہی کے ان کی ترقی عہدۂ صدر الصدوری پر جلد ہوگی اور ہماری بھی آرزو ہے۔ سوا اس کے ہم رپورٹ کرتے ہیں کہ انہی کی خیرخواہی کے سبب سے حکام انگریزی ضلع بجنور سے صحیح سلامت تشریف لائے اور بلحاظِ کارگزاری اُس وقت کے کہ ضلع ڈپٹی صاحب اور ان کے سپرد ہوا، مناسب ہے کہ پنشن دو سو روپیہ ماہواری، خواہ دائمی خواہ حینِ حیات، ان کے اور ان کے بڑے بیٹے کے سرکار سے عنایت ہو۔ اور یہ تجویز اس نظر سے ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ سید احمد خاں کا ارادہ ہے کہ بعد چند سال کے سیر اقالیم کی کریں، اِس سبب سے زمینداری لینا منظور نہیں ہے۔''[۴۰]

''ان کا نقصان بھی بہت ہوا، کس واسطے کہ شروع غدر میں ان کے عیال اور اطفال دہلی میں تھے۔ اور ہم نے اس بات کو خوب دریافت کرلیا کہ بہ سبب ان کی خیرخواہی کے باغیوں نے ان کے گھر کو لوٹ لیا۔ مکانات تو مل گئے ہیں مگر نقصان مال اور اسباب کا، جو دہلی اور بجنور میں ہوا، تخمیناً تیس ہزار تین سو چوراسی روپیہ کا قرار دیتے ہیں۔''[۴۱]

متذکرہ بالا رپورٹ انگریزوں کے حق میں سرسید کی جاں نثارانہ خدمات اور ''خبریں'' پہنچاتے رہنے کا سرکاری اعتراف ہے۔ اس کے صلے میں اُن پر جو نوازشات کی گئیں، اُن کا ذکر اُنہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''اس کے عوض میں سرکار نے میری بڑی قدردانی کی، عہدہ صدر الصدوری پر ترقی کی اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائے اور خلعت پانچ پارچہ اور تین رقم جواہر، ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا، اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدد خرچ کے مرحمت فرمایا۔'' [۴۲]

سرکاری رپورٹ میں آپ نے صاف ملاحظہ فرمایا کہ سرسید کا ارادہ ملک میں رہنے کا نہیں تھا، اس وجہ سے انہیں جاگیر لینا منظور نہ ہوا تو اس کے بدلے میں دو نسلوں تک دو سو روپیہ ماہوار پنشن قبول کر لی۔ بعد میں سرسید، اُن کے رفقا اور سوانح نگاروں نے جاگیر لینے سے انکار کو ''قومی ہمدردی'' قرار دیا اور اس پر خوب حاشیے چڑھائے۔ سرسید نے اسے اس طرح بیان کیا:

''جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیئر نے، جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہان آباد، جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی ملکیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے، اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔'' [۴۳]

خواجہ الطاف حسین حالی نے اس واقعے کے ضمن میں نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد کی لکھی ہوئی ایک تحریر کا حوالہ دیا ہے جس کے بیان میں یوں رنگ آمیزی کی گئی ہے:

''سرسید احمد خاں کو حُسنِ خدماتِ غدر کے صلہ میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا

مگر سید احمد خاں نے صرف اس وجہ سے اُس کے لینے سے انکار کیا کہ
ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا
نہیں ہوسکتی تھی۔'' [۴۴]

سیدھی سی بات ہے کہ جب انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا تو تعلقہ قبول نہ کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مگر جذبات نگاری اسے اور ہی رنگ دے رہی ہے۔ اس کے عوض میں سر سید کی ماہوار پنشن کے دو سو روپے (یا سالانہ ۲۴۰۰ روپے) کوئی کم معاوضہ نہ تھا، اس کی مالیت کا تعین اُس زمانے میں روپے کی قوتِ خرید کے مطابق کرنا ضروری ہے۔ یہ امر قابلِ تحقیق ہے کہ سن ستاون ؁ میں انگریزوں کے حق میں سر سید کے ''کارناموں'' کا اصل مقصد کیا تھا؟ اگر وہ محض اُن کی خیر خواہی کا دم بھرتے تھے اور اُن کے ساتھ دلی طور پر مخلص تھے تو پھر انعام واکرام قبول کرنے کے کیا معنی؟ اور خاص کر ایسے وقت میں جب اہلِ وطن پر افتاد پڑی ہوئی تھی اور وہ اُن کے آقاؤں کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے، یہ امر اُنہیں کسی طرح زیب نہیں دیتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُن کا یہ حق ضرور بنتا تھا کہ وہ اِن ہنگاموں میں ہونے والے ذاتی نقصان کا معاوضہ وصول کرلیں۔ اِس کے مقابلے میں ہمیں دہلی کے مولوی عبدالرحمٰن بہت بھلے لگے جنہیں ایک انگریز کی امداد کرنے کے صلے میں جاگیر کی پیشکش ہوئی تو اُنہوں نے اِس انعام کو ٹھکراتے ہوئے انگریز افسر سے کہا کہ ''آپ نے میری سوچ کو غلط سمجھا۔ میں نے آپ کی امداد انعام لینے کے لئے نہیں کی تھی بلکہ یہ مسئلہ میری سمجھ میں اِسی طرح آیا تھا''۔ [۴۵]

جذباتی انداز میں بات کرنے والے بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ''باغی'' مسلمانوں کا ضبط شدہ مال ومتاع آخر ملکی خزانے ہی میں جمع ہوا۔ پھر اِسی خزانے سے انعام واکرام اور ماہوار رقوم کی وصولی کیا اُن مسلمان بھائیوں کے خون سے پیاس بجھانے کے زمرے میں نہیں آتی؟

سر سید احمد خاں کی انگریز نواز حکمتِ عملی کو اُن کے پرستار ''وقتی مصلحت'' یا ''اُس عہد کے حالات کے تناظر میں وقت کا تقاضا'' قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق سر سید نے یہ حکمتِ عملی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی پر مسلمانوں کی حالتِ زار سے متاثر ہوکر اپنائی کیونکہ اُس وقت قوم کو انگریزوں کے انتقامی غیظ وغضب سے بچانے کا یہی واحد راستہ تھا۔ اِس امر کے

تجزیے کے لئے ہمیں ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا۔ سرسید کے تذکروں میں اُن کا جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد قوم کی حمایت میں کمر بستہ ہونے کا ذکر تو ملتا ہے مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ خاص اس جنگ کے دوران اُن کا ذاتی قومی کردار کیا رہا۔ نہ بتانے کی بھی کوئی وجہ ہے۔ یہ بے چارے تذکرہ نگاروں کی مجبوری ہے۔ اُن کے ہاں ایک مدت سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ سرسید کے معاملے میں بعض حقائق پر پردہ پڑا رہنے دیا جائے۔ ان لوگوں کی یہ زبردست مجبوری رہی ہے کہ سرسید نے اپنی تحریروں میں جنگِ آزادی کو جن برے برے ناموں سے یاد کیا ہے اور مجاہدین حُریت کو جن غلیظ گالیوں سے نوازا ہے، اسے دانستہ قارئین کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے۔ ذیل میں ان القابات کی ایک فہرست ملاحظہ فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ بھی کوئی وقت کا تقاضا تھا؟

جنگِ آزادی:

ہنگامۂ غدر۔[46] ہنگامۂ قتل وغارت۔[47] ہنگامۂ مفسدی و بے ایمانی و بے رحمی۔[48] سرکشی۔[49] ہنگامۂ فساد۔[50] نمک حرامی۔[51] ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال۔[52]

مجاہدینِ حُریت:

مفسد۔[53] حرام زادہ۔[54] نمک حرام۔[55] غنیم۔[56] دشمن۔[57] غادر۔[58] کافر۔[59] بے ایمان۔[60] بدذات۔[61] پاجی۔[62] جاہل۔[63] بدرویہ۔[64] بداطوار۔[65] تماش بین۔[66] شراب خور۔[67]

افعالِ مجاہدینِ حُریت:

جبر۔[68] ظلم۔[69] سرکار کی نمک حرامی، بدخواہی، ناشکری۔[70] دغا۔[71] بدعہدی۔[72] بلوہ۔[73] بے ایمانی۔[74] بے رحمی۔[75]

نعرۂ جہاد:

مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرم زدگی[76]

قائدین جنگِ آزادی:

نواب محمود خاں: کم بخت نا محمود خاں۔ [77] بدذات۔ [78] ظالم۔ [79]

احمد اللہ خاں: بدذات۔ [80] بدنیتی اور فساد کا پتلا۔ [81]

ماڑے خاں: عرف ماڑے بدمعاش۔ [82] قدیمی بدمعاش۔ [83] پکا بدمعاش۔ [84] بے رحم۔ [85] مفسد۔ [86] حرامزادہ۔ [87]

عنایت رسول: نامی باغی [88] مشہور حرام زادہ [89]

خان بہادر خاں: بدذات۔ [90] بے ایمان۔ [91] نمک حرام۔ [92]

بہادر خاں (رام پور): بدمعاشوں کا سرگروہ۔ [93] بدمعاشوں کا سردار۔ [94]

مولوی وہاج الدین: منو نامی بدمعاش۔ [95] جاہل۔ [96]

اس کے علاوہ جنرل بخت خاں کو ''باغیوں کا سرغنہ'' تحریر کیا۔ [97]

ہمارے اہلِ قلم اپنی تحریروں میں سرسید کی متذکرہ بالا تمام ''خدمات'' اور ''گوہر افشانی'' کا ذکر مکمل طور پر گول کر جاتے ہیں اور بات اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب اِس قسم کے خیر خواہوں نے اپنے انہی ملک دشمن کرتوتوں کے باعث قوم کو انگریزوں کا نشانۂ انتقام بننے کا مکمل سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ اس مقصد کے لئے پہلے ایک خوفناک منظر کا سماں باندھا جاتا ہے، انگریز مسلمانوں پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑ رہے تھے اُس کا نقشہ کھینچا جاتا ہے، قوم کی زبوں حالی کا ذکر کیا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ اس صورتِ حال پر سرسید خاموش نہ رہ سکے، وہ قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے کے لئے آگے بڑھے اور انگریزوں سے مفاہمت کی راہ اختیار کی۔ اس سے وہ اُن ''بدگمانیوں'' کو دور کرنا چاہتے تھے جو انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف پیدا ہو گئی تھیں۔

بدگمانی وہ غلط خیال ہے جو دل میں کسی وجہ سے دوسرے کے خلاف پیدا ہو جائے۔ یہ بدگمانی نہیں، حقیقت تھی اور انگریزوں کے لئے ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ مسلمانوں نے اس لڑائی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ جب ایک فریق دوسرے کا براہِ راست نشانہ بنے تو وہ مقابل کے عزائم کو بدگمانی کیونکر خیال کر سکتا ہے؟ دراصل انگریز مسلمانوں سے اس لئے خائف تھے کہ یہ قوم اس

ملک پر سینکڑوں سال حکمران رہنے کے باعث خود کو حکومت کا حقدار اور اہل سمجھتی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان اُن کے لئے کسی وقت بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا اِس جنگ میں پیش پیش ہونا اور دہلی کے مغل دربار کو اس کا مرکز بنانا اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ انگریز سمجھتے تھے کہ ظلم و جور اور خوف و ہراس اُن کی صلاحیتوں کی راہ میں عارضی طور پر تو رکاوٹ بن سکتے ہیں مگر انہیں مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتے۔ بالآخر اُن کے دور اندیش دماغ نے سوچا کہ اگر یہ کام مسلمانوں ہی میں موجود اپنے بااعتماد خیر خواہوں کو سونپ دیا جائے تو دیرپا ثابت ہوگا۔ پس انہیں ایسے باصلاحیت ''شرفا'' کی تلاش ہوئی جو قوم کے ہمدرد بن کر اُن کے دلوں سے حکومت کی خواہش اور انگریز مخالف جذبات نکال سکیں۔ اس مقصد کے لئے سر سید نے اپنی خدمات رضا کارانہ پیش کیں اور وفادار ٹولے کے چند ''نیک نام'' افراد کو ساتھ لے کر مسلمانوں کو امن کی تلقین کرتے ہوئے انگریزوں کی وفاداری کا درس دینے لگے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں جذبات کا سخت عمل دخل رہا۔ اُن میں قوم کے نوحے بھی شامل تھے اور روشن مستقبل کی اُمیدیں بھی۔ شاید سر سید کے شیدائی اِس حکمتِ عملی کی وضاحت نہ کر سکیں کہ پہلے اپنے ہی گھناؤنے کردار سے مسلمانوں کو تباہی و بربادی کے کنارے پہنچایا جائے اور پھر اُن کا ہمدرد بن کر رونے دھونے کا دھندا شروع کر دیا جائے۔

سر سید کی انگریز پرستی کا عمل اُن کے آخری سانس تک جاری رہا۔ قومی فلاح کے نام پر اُن کے تجویز کئے گئے تمام تعلیمی، سماجی اور سیاسی منصوبوں میں یہ نقش نمایاں طور پر موجود ہے۔ یہ تسلیم کہ جنگِ آزادی کی ناکامی کے فوراً بعد غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اختیار کرنا مصلحتِ وقت تھی اور ایسا ہونا ہر اُس جنگ کے بعد کا مجبوری تقاضا ہوتا ہے جس میں فاتح کو مفتوح کے ملک پر مکمل کنٹرول حاصل ہو، تاہم اس صورتِ حال میں شکست خوردہ فریق کو ہمیشہ کے لئے غلامی قبول کئے رکھنے پر آمادہ کرتے رہنا انسانیت کی تذلیل ہے اور مفتوح قوم کا اِس پر آمادہ ہو جانا اُس کی بے غیرتی کی دلیل ہے۔ یہ امر مدِنظر رکھا جانا نہایت ضروری ہے کہ عہدِ سر سید اُن کے انتقال ۱۸۹۸ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے اُس وقت تک چالیس سال سے زیادہ کا وقفہ ہے۔ اس دوران میں حالات بہت حد تک بدل چکے تھے۔ وقوعہ ۱۸۵۷ء کے

منفی اثرات زائل ہو چکے تھے، کرۂ ارض کے متعدد ممالک میں بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بھی آزادی کی نئی تحریکیں جنم لے چکی تھیں، سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد زوروں پر تھی اور عوام بلاخوف وخطر اِس میں شرکت کرنے لگے تھے مگر سرسید تادمِ آخر انگریزوں کی تعریف میں رطبُ اللسان رہے۔ وہ اُن کی حکومت کے استقلال اور دوام کی دعائیں کرتے رہے اور اُسے استحکام بخشنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کئے رکھیں۔ یقین کیا جاسکتا ہے کہ اگر سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء کی بجائے ۱۹۴۷ء میں ہوتا تو بھی ان کی حکمتِ عملی یہی رہتی اور ہمارے دانشور بھی اس کے جواز میں ''وقت کا تقاضا'' کی راگنی الاپتے رہتے۔ دراصل اندھی عقیدت انسان کے فہم وادراک کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے لیتی ہے اور اس بے بسی میں دلائل کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی لہٰذا ان لوگوں سے حقائق قبول کرنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ جب اِس طبقہ سے کوئی جواز بن نہیں پڑتا تو بعض دوسرے مشہور لوگوں کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اس حمام میں سبھی ننگے تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر اُس وقت کے نامور ''شرفا'' بھی انگریز پرستی کا شکار تھے تو یہ قومی خدمت کا کوئی معیار نہیں بن جاتا اور نہ اِسے وقت کا تقاضا قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱- سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۱۴۱

۲- اسباب سرکشی ہندوستان (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء) ص ۴۳

۳- لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) جلد دوم، ص ۳۲

۴- سرکشی ضلع بجنور، ص ۱

۵- مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز سرسید (مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۹۹

۶- مکتوبات سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد اوّل، ص ۱۹۷۶ء) ص ۴۰۹

۷- سفرنامہ پنجاب (مرتبہ: سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء) ص ۲۶۱-۲۶۲

۸- لائل محمڈنز آف انڈیا (جلد اوّل) ص ۱۳

۹- حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ اول، ص ۶۹
۱۰- سرکشی ضلع بجنور، ص ۱۳
۱۱- لائل محمڈنز آف انڈیا (جلد اوّل) ص ۱۴
۱۲- سرکشی ضلع بجنور، ص ۷
۱۳- ایضاً، ص ۱۳
۱۴- لائل محمڈنز آف انڈیا (جلد اوّل) ص ۱۵
۱۵- سرکشی ضلع بجنور، ص ۳۲-۳۳
۱۶- ایضاً، ص ۳۵
۱۷- ایضاً، ص ۳۷
۱۸- ایضاً، ص ۶۱-۶۲
۱۹- ایضاً، ص ۶۸
۲۰- ایضاً، ص ۷۰
۲۱- ایضاً، ص ۹۶
۲۲- ایضاً، ص ۹۸
۲۳- ایضاً، ص ۱۰۲-۱۰۳
۲۴- ایضاً، ص ۱۰۳
۲۵- ایضاً
۲۶- ایضاً، ص ۱۰۶
۲۷- ایضاً، ص ۱۰۴
۲۸- حیاتِ جاوید (حصہ اوّل) ص ۷۹
۲۹- سرکشی ضلع بجنور، ص ۱۰۴
۳۰- حیاتِ جاوید (حصہ اوّل) ص ۴۷
۳۱- سرکشی ضلع بجنور، ص ۶۷
۳۲- سیرتِ فریدیہ (سرسید احمد خاں) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۶ء) ص ۵۴ تا ۵۶
۳۳- ایضاً، ص ۴۰
۳۴- سرکشی ضلع بجنور، ص ۱۳۳
۳۵- لائل محمڈنز آف انڈیا (جلد اوّل) ص ۱۸-۱۹
۳۶- ایضاً، ص ۱۹ تا ۲۱

۳۷- ایضاً،ص۲۱
۳۸- ایضاً
۳۹- ایضاً،ص۲۲
۴۰- ایضاً،ص۲۵
۴۱- ایضاً،ص۲۶
۴۲- ایضاً،ص۱۷
۴۳- مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز سر سید،ص۳۹۹
۴۴- حیاتِ جاوید(حصہ اوّل)ص۸۰
۴۵- انگریز کے باغی مسلمان(جانباز مرزا) مکتبہ تبصرہ لاہور(۱۹۹۰ء)ص۴۳۲
۴۶- اسباب سرکشی ہندوستان،ص۲
۴۷- لائل محمڈنز آف انڈیا(جلددوم)ص۱۵
۴۸- ایضاً،ص۱۳
۴۹- سرکشی ضلع بجنور،عنوان
۵۰- ایضاً،ص۱۴۱
۵۱- ایضاً،ص۵
۵۲- ایضاً،ص۱۴۱
۵۳- ایضاً،ص۱۰۳
۵۴- ایضاً
۵۵- ایضاً،ص۱۳
۵۶- ایضاً،ص۱۳۷
۵۷- ایضاً
۵۸- لائل محمڈنز آف انڈیا(جلددوم)ص۲۷
۵۹- ایضاً،ص۳۰
۶۰- ایضاً
۶۱- ایضاً،ص۳۲
۶۲- اسباب سرکشی ہندوستان،ص۶
۶۳- ایضاً
۶۴- ایضاً،ص۷

۶۵- ایضاً

۶۶- ایضاً

۶۷- ایضاً

۶۸- ایضاً

۶۹- ایضاً

۷۰- لائل محمڈنز آف انڈیا (جلداوّل) ص ۵

۷۱- ایضاً (جلد دوم) ص ۲۳

۷۲- ایضاً

۷۳- ایضاً، ص ۲۷

۷۴- ایضاً، ص ۱۳

۷۵- ایضاً

۷۶- اسباب سرکشی ہندوستان، ص ۷

۷۷- سرکشی ضلع بجنور، ص ۲۲-۲۳

۷۸- ایضاً، ص ۳۳

۷۹- ایضاً، ص ۶۱

۸۰- ایضاً، ص ۱۶

۸۱- ایضاً، ص ۴۱

۸۲- ایضاً، ص ۳۹

۸۳- ایضاً

۸۴- ایضاً، ص ۴۱

۸۵- ایضاً، ص ۱۱۵

۸۶- ایضاً، ص ۹۰

۸۷- ایضاً، ص ۱۱۵، ۱۳۶

۸۸- ایضاً، ص ۱۳۸

۸۹- ایضاً

۹۰- ایضاً، ص ۲۳

۹۱- ایضاً، ص ۲۲

۹۲- ایضاً

۹۳- لائل محمڈنز آف انڈیا (جلد سوم) ص ۱۳

۹۴- ایضاً

۹۵- ایضاً (جلد دوم) ص ۴۲-۴۳

۹۶- ایضاً ص ۱

۹۷- ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر (سر سید احمد خاں) ہنری ایس کنگ لندن (۱۸۷۲ء) ص ۲۳

منشی سیّد رجب علی کی خدماتِ فرنگ

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری میں انگریز کے جن خیر خواہوں نے نمایاں کردار ادا کیا، ان میں مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی سرِ فہرست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اپنوں ہی کا کارنامہ تھا کہ جنرل بخت خاں دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد بادشاہ کو اپنے ہمراہ چلنے کے لئے آمادہ نہ کرسکا[1] اور کیپٹن (بعد میں میجر) ہڈسن اپنے شکار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ متعدد شہزادے، بیشمار رہنمایان انقلاب اور ہزار ہا افراد گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ جو بچے، وہ انتقام کی چکی میں پسنے لگے۔ ان پر جھوٹے سچے مقدمات قائم ہونے لگے تو خیر خواہوں کو انعام و اکرام کے حصول کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آ گیا۔ حُرّیت پسندوں کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا گیا، پھانسیاں دی جانے لگیں، متعدد افراد کالے پانی بھیج دئے گئے اور بادشاہ اسیری کی زندگی اپنا کر رنگون سدھارا۔

تاریخی کتب بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری میں زیادہ تر مرزا الٰہی بخش کی مساعی کو سب سے بڑا ذریعہ قرار دیتی ہیں اور منشی رجب علی کی کوششوں کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔ بعض تذکروں میں بادشاہ کو مقبرہ ہمایوں سے گرفتار کرنے کا ''ہیرو'' کلی طور پر ہڈسن کو قرار دیا جاتا ہے۔ بعض روایات میں بادشاہ کے مقبرہ ہمایوں سے نکلنے کے وقت وہاں موقع پر ہڈسن کے موجود ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس موضوع پر فائلوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے ایک فائل میں ایسے شواہد دستیاب ہوئے جن سے ان روایات کی بابت ذرا مختلف

حالات کا پتہ چلتا ہے۔ان دستاویزات میں منشی رجب علی کا کردار بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس واقعے میں جہاں دوسروں کی زبانی اس کی خصوصی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، وہاں وہ خود بھی بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کا آلۂ کار بننے کا سہرا ''بلاشرکتِ غیرے'' اپنے سر باندھتا ہے اور اس کے ثبوت میں متعلقہ حکام کی اسناد بھی پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے بیان میں دعویٰ کرتا ہے کہ جب وہ اپنی کوششوں سے بادشاہ کو خودسپردگی پر قائل کر کے مقبرہ ہمایوں سے نکال لایا تو نصف راہ میں اس کی اطلاع پر کیپٹن ہڈسن اس کے ساتھ شریک ہوا۔

منشی رجب علی سرکاری کاغذات میں اپنے خاص پیشہ ''منشی'' کی بجائے ''مولوی'' کے نام سے معروف ہے کیونکہ اس دور میں پڑھے لکھے دیسی مسلمان مولوی کہلاتے تھے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے عطا کردہ خطابات کے ساتھ وہ ''ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خان بہادر'' کہلانے کا مستحق تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء میں ہڈسن کی سربراہی میں انگریزی حکومت کے شعبہ جاسوسی کا باقاعدہ تنخواہ دار ملازم تھا۔ جیمز ہیوٹ (James Hewitt) لکھتا ہے:

''(ہڈسن کو) دہلی فیلڈ فورس میں انٹیلی جنس افسر تعینات کیا گیا۔ اس کے پاس معزز گھرانے میں جنم لینے والا ایک قابلِ قدر جاسوس یک چشم رجب علی بھی تھا۔ دونوں نے مل کر دہلی کے اندر دوسروں کو الزام میں لپیٹنے والے جعلی خطوط لکھے اور اس طرح وہاں بے اطمینانی اور نااتفاقی کے بیج بوئے۔'' [۲]

مولوی ذکاء اللہ دہلوی مؤلف ''تاریخ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیہ'' کے بیان کے مطابق، جسے غلام رسول مہر نے "History of the Indian Mutiny" کے مؤلف میلی سن (Malleson) کی تحریر کا چربہ بتایا ہے، انگریزوں کے لئے منشی رجب علی کی خصوصی اہمیت یوں اجاگر ہوتی ہے:

''سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ اس مخبری کے لئے، کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے، دہلی میں رہتے تھے، ان سب کے سردار منشی رجب علی تھے۔ جاسوسی کے لئے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہییں، وہ ان میں تھیں۔ انگریز منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے۔ سچی بات

دریافت کر لینے کی عجیب قابلیت واستعداد اور فراست وکیاست رکھتے تھے۔'' [۳]

کیو براؤن (Cave Brown) اپنی ایک تالیف میں رجب علی کی اہلیت اور اس کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بوڑھا مولوی اگرچہ کٹر مسلمان تھا مگر وہ ایسی وفاداری اور سرگرمی کے ساتھ، جس کا اس بحران کے دور میں اندازہ لگانا مشکل ہے، شہر کی ہر قسم کی خبریں، جن کا جاننا ہمارے لئے ضروری تھا، شہر کے عین وسط میں رہتے ہوئے روزانہ ارسال کرتا تھا۔ وہ کاغذ کے پرزوں کو کپڑوں کی تہوں میں سی کر یا چپاتیوں، جوتوں کے تلووں، پگڑی کی تہوں یا سکھوں کے بالوں کے جُوڑوں میں کہیں نہ کہیں اس طرح چھپا دیتا تھا کہ وہ پکڑے نہ جا سکیں۔ اس کا طریقۂ کار اس قدر اعلیٰ تھا کہ اس پر شک کا ہلکا سا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ شہر میں رجب علی اور کیمپ میں ہڈسن اس طرح تھے جیسے بجلی کی تار کے دو سرے، اور انہی کے ذریعے باغیوں کے منصوبوں اور ان کی نقل وحرکت کی انتہائی قابلِ اعتماد اطلاعات روزانہ مہیا ہوتی تھیں۔'' [۴]

منشی رجب علی کے انگریزوں سے تعلقات کی نوعیت اور اس کا پس منظر سمجھنے کے لئے اس کے سوانحی خاکہ کے اہم اقتباسات اس کی اپنی تحریر سے، جو اس نے اپنے خاندانی حالات کے ضمن میں ''تحقیقاتِ چشتی'' میں درج کروائی تھی، درج ذیل ہیں:

''حال راقم کہ یہ کہ ۱۸۰۶ء سمت ۱۸۶۲ بکرماجیت بمقام تلونڈی اپنی جاگیر میں تولد ہوا۔ سمت ۱۸۶۴ (یعنی ۱۸۰۷ء) میں دیوان محکم چند، افسر فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ، نے تلونڈی کو مع دیہات بے سبب بلا وجہ ضبط کر کے ہمارے بزرگوں کو جلاوطن کر دیا۔ وہاں سے نکل کر جگراؤں میں آئے۔ سردار فتح سنگھ بہادر آہلووالیہ نے محض عالی جاہی سے دو حویلیاں لائق واسطے استقامت کے جگراؤں میں عطا کئے، اور پھر راجہ نہال سنگھ، ان کے فرزند، نے کچھ زمین باغ کے لئے بخش دی اور ہمیشہ مہربانی کرتے رہے۔ پھر راقم واسطے تحصیلِ علوم کے بعمر دوازدہ سالگی لاہور

کو گیا اور علومِ طبیہ کو سید خیر شاہ لاہوری تلمیذ حکیمِ اعلیٰ سے حاصل کیا اور کتب امامیہ کو مُلّا مہدی خطائی تلمیذ جناب مُلّا محمد مقیم صاحب، کہ تلامذہ جناب شیخ حر عاملی علیہ الرحمہ سے، کہ علماء اعلام شیعہ سے ہیں، پڑھا۔ تھوڑی صرف ونحو بھی حاصل کی۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی میں مدرسہ تجویز ہوا۔ حکام در پے اشاعتِ علوم متوجہ ہوئے تو راقم نے بھی علوم متداولہ رسمیہ وہاں حاصل کیا اور مدرسہ دہلی میں مدرس علمِ ریاضی کا رہا۔ (علمِ ریاضی میں منشی رجب علی کو سرسید کے نانا نواب دبیرالدولہ خواجہ فریدالدین احمد کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے۔[دیکھیے: سرسید کی تصنیف ''سیرتِ فریدیہ''، ص۳۳]۔مؤلف) حکام حضور چارلس مٹکاف صاحب بہادر اور ایلیٹ صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی عنایت کرتے تھے، خصوصاً سر چارلس ٹرولین صاحب، جو اَب مدراس میں گورنر ہیں، ان کی عنایتوں کی تو نہایت نہیں، بہت نظرِ عنایت میرے حال پر مبذول تھی، بلکہ جب حضور لارڈ امہرسٹ صاحب گورنر جنرل ہندوستان نے دہلی میں بعد فتح بھرت پورہ دربار کیا تو میں بھی بذریعہ رضیعہ انہی صاحبان جلیل الشان کے حاضرِ دربار ہو کر خلعت سے معزز و ممتاز ہوا اور بمقتضائے قدردانی علم کے پیشگاہِ بندگانِ حضور لارڈ گورنر جنرل بہادر سے دربار میں کرسی بھی مرحمت ہوئی۔ ۱۸۳۰ء میں بعد قطع تعلق مدرسہ براہِ آگرہ گوالیار وارد ہوشنگ آباد ہوا۔ تب جان ریف اوسلی صاحب بہادر وہاں حاکم تھے۔ تعریف ان کے اخلاق کی بیرون از احاطۂ تحریر ہے۔ خصوصاً جو مجھ پر عنایتیں کرتے تھے، میں بیان ان کا نہیں کر سکتا......''

''جب وارد انبالہ ہو کے ملازمت حضور آنریبل سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر، جن کے اوصاف زبانِ قلم قاصر ہے، حاصل کی تو صاحب موصوف نے یکم فروری ۱۸۳۴ء کو بخدمت منشی گری ملک محفوظہ مابین جمن و ستلج اولاً و میر منشی ممالک پنجاب ثانیاً مامور فرمایا۔ جب سے خدمت جارج براڈفٹ صاحب بہادر و سر فریڈرک گرے بارفٹ صاحب بہادر و سر ہنری لارنس صاحب

بہادر و بندگانِ حضور مسٹر جان لارنس صاحب بہادر، جو بفضلِ الٰہی سریر آرائے محکم گورنری کشورِ ہند ہیں، بمقدور خود کاروبار میں سرگرم رہا۔ انہی گورنر جنرل بہادر کو، جب حاکمِ اعلیٰ لاہور کے تھے، ۱۸۵۳ء میں استعفا دے کر بحصولِ رخصت وخلعت و خط انگریزی و جاگیر وارد جگراؤں ہوا۔ بعد اس کے حسب الطلب سر ہنری لارنس صاحب بہادر ملک راجپوتانہ کا بھی سر کیا......''

''مفسدہ ۱۸۵۷ء میں بمقام دہلی بالائے پہاڑی کیمپوئے سرکار میں بعہدہ میر منشی گری کمانڈر انچیف بہادر معزز و ممتاز ہو کر تحت جناب جرنیل بچر صاحب بہادر جو کچھ خدمت مجھ سے ہوسکی، اس سے قاصر نہ رہا۔ بعد تسخیرِ دہلی بحصولِ رخصت وطن میں آیا۔ جب جارج کارنک بارنس صاحب بہادر کمشنر ایں روئے ستلج نے رپورٹ اہلِ خدمت کی کی تو پیشگاہِ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل کشورِ ہند وائسرائے سے خلعت پانچ ہزار روپیہ بذریعہ بندگانِ حضور سر جان لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل حال مرحمت ہوا اور کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی اور خطاب ارسطو جاہ کا ملا اور خطاب خان بہادر کا مہم لاہور میں پیشگاہِ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر گورنر جنرل سابق سے عطا ہو چکا تھا۔ ۱۸۶۱ء و ۱۸۶۳ء میں براہِ سکھر و کراچی و بمبئی و عدن مشرف بہ حج و زیارت ہو کر وارد جگراؤں ہوا اور بتقریب سیر عجائب خانہ کے بھی بحضور صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب حاضر ہو کر موردِ مراحم بے پایاں ہوا اور شکر گزار عنایات مرخص ہوا......''

''جنابِ باری اس دولتِ انگلسی کو روز بروز ترقی بخشے کہ طرح طرح کی ترقیات کشورِ ہندوستان میں بہ نیت نیک حکام سپہر مقام عمل میں آئی ہیں۔ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت اور قابلیت نہیں مگر الحمد للہ کہ اوقات میرے عزت و آبرو سے بسر ہوئے۔ حکامِ عہد ہمیشہ عزت افزائی میں مصروف رہے اور امثال و اقران میرے مجھ کو ہمیشہ بنظرِ اعتبار و اقتدار دیکھتے رہے۔ صاحبان ڈپٹی کمشنر بہادر لدھیانہ ابتدا سے آج تک مجھ پر نظرِ عنایت مبذول رکھتے

ہیں، چنانچہ اب چارلس ایلیٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر حال بہت نظرِ عنایت رکھتے ہیں۔'' [۵]

یہ ہے منشی رجب علی کی زندگی کا ایک مختصر خود نوشت خاکہ۔ اگر چہ اس میں اس نے ۱۸۵۷ء کے دوران انجام دی جانے والی اپنی خصوصی کارگزاریوں کی نشان دہی نہیں کی، تاہم اس پر ہونے والی انگریزی نوازشات اور خطابات کی روشنی میں اس کے کارہائے نمایاں کا پس منظر سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ وہ اس قدر بااثر اور نڈر تھا کہ ایسے نازک دور میں بھی، جبکہ دہلی میں کوئی شخص انگریزوں کے حق میں کسی قسم کا ہلکا سا اشارہ کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہوئے بادشاہ سے براہِ راست مل کر اسے انگریزوں کے حق میں آمادہ کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ انگریز حکام کو بھیجی جانے والی اس کی ایک خفیہ رپورٹ کا درجِ ذیل اقتباس قابلِ غور ہے:

''میں نے بادشاہ سلامت کو مشورہ دیا تھا کہ ان کو چاہیے کہ خفیہ طور پر شہر کا دروازہ کھلوا کر انگریزی فوج کے شہر میں داخل ہونے کا بندوبست کریں۔ اس طرح ان کی جان تو شاید نہ بچ سکے لیکن اس احسان کے بدلے انگریز ان کے ورثا سے اچھا سلوک کریں گے۔ بادشاہ سلامت تو راضی ہو جاتے لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے دخل اندازی کر کے معاملہ خراب کر دیا۔'' [۶]

یہ رپورٹ ۲۹ جولائی کی لکھی ہوئی ہے۔ اگلے روز یعنی ۳۰ جولائی کو وہ غالباً حکیم احسن اللہ خاں کی متذکرہ ''دخل اندازی'' کے جواب میں اس کے نام فارسی میں ایک مراسلہ تحریر کرتا ہے جس میں انگریزوں کی قوت کی عظمت کے حوالے سے ارکانِ سلطنت کو ''فتنہ وفساد'' روکنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس مراسلے کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

''حکیم صاحب فلاطون فطنت، ارسطو حکمت،
یکتائے زمان، دانائے دوران، سلامت!

رسمی وروایتی آداب سے قطع نظر گزارش یہ ہے کہ کم وبیش دو ماہ سے انگریزی سرکار

کی نمک خوار فوج ناعاقبت اندیشی سے دہلی پہنچ کر فتنہ وفساد برپا کئے ہوئے ہے۔ فوج نے بادشاہ سلامت کا نام بدنام کر دیا ہے، اپنی چادر سے باہر پاؤں نکالے ہیں اور خود کو انگریزی حکومت کے مدّ مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ صورتِ حال بالکل مولانا روم کے اس شعر کے عین مطابق ہے:

آں مگس بر برگِ کاہ و بولِ خر　　　　ہمچو کشتی باں ہمی افراشت سر

(گھاس کے پتے یا گدھے کے پیشاب پر بیٹھی ہوئی مکھی

ملاحوں کے بادبانوں کی طرح سر اُٹھائے ہوئے ہے)

بادشاہ سلامت پر، آپ پر اور دنیا بھر کے عقل مندوں پر انگریزی حکومت کی عظمت واقتدار کا حال واضح ہے اور معرکۂ روس کے حالات دوپہر کے سورج کی طرح روشن ہیں کہ ملکۂ انگلستان خلد اللہ ملکہا وسلطانہا نے بادشاہِ روم سلطان عبدالحمید خاں کی اعانت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس سلسلے میں زرِ کثیر خرچ کیا اور اسلامی سلطنت کی حفاظت کے لئے سمندر اور خشکی میں اپنی فوجیں تعینات کیں اور روسیوں سے اتحاد کے باوجود رومیوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا نقصان پسند کیا اور اس سلسلے میں کتنی کوششیں کیں .... ہندوستان کے حکمرانوں سے ایسا اب تک نہیں ہوسکا تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو جبراً عیسائی مذہب اختیار کرنے کے لئے نہیں کہا گیا بلکہ لوگ اپنے دینی ودُنیوی امور میں جس طرح چاہتے ہیں، آزادانہ رہتے ہیں۔ باقی تفصیلات آپ پر چھوڑتا ہوں کہ طوالتِ بیان مقصود نہیں۔''

''کسی حکمران نے ہندوستان پر ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ سے بہتر حکومت نہیں کی۔ اس کا حال تاریخِ فرشتہ سے واضح ہے کہ بادشاہ موصوف کی قوت وشوکت کے زمانۂ عروج میں ہندوستان سے حجاز کو جانے والے شاہی بحری جہاز انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس زمانے میں انگریزوں کو ہندوستان میں کوئی عمل دخل نہیں تھا، اس کے باوجود اکبر بادشاہ وہ جہاز اور اموال واپس نہیں

لے سکے تھے۔ اور اب جبکہ ہندوستان کی سرزمین دریائے شور سے پشاور تک انگریزوں کے تسلط میں ہے، ان داناؤں اور بہادروں سے کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ اگر ان ناعاقبت اندیشوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں سستی اور تاخیر ہوئی تو عوام ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جائیں گے بلکہ دوست اور دشمن اور عقلمند اور بیوقوف میں تمیز جیسی ملکی مصلحتیں پیشِ نظر ہیں۔ جب تک فسادیوں کی یہ جماعت دہلی میں داخل نہیں ہوئی تھی، شاہی دربار کی طرف سے انگریزوں کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ اب کیا انقلاب آ گیا ہے، کونسی امید لگ گئی ہے؟ راسخ الاعتقاد غلام جوہرِ عقل سے آراستہ ہونے کے باوجود اس سراجِ ہند کی لو بجھانے کے در پے کیوں ہیں اور چغتائی خاندان کے اس چشم و چراغ کی بقا اور فروغ سے کیوں بے توجہی برت رہے ہیں؟ شاہی کارندوں کے دماغ میں یہ کیا خیالِ محال سما گیا ہے؟ اور اگر شاہی حکم نہیں ہے تو اب تک اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی اور اس فتنہ وفساد کی بیخ کنی کے لئے کوشش کیوں نہیں کی گئی؟ بہتر یہی ہے کہ اگر دربارِ شاہی کے اربابِ مناسب خیال فرمائیں تو تمام صورتِ حال اصالتاً یا وکالتاً، تحریری طور پر یا زبانی، انگریز صاحبان کی خدمت میں بیان کی جائے۔ اس فتنے کے خاتمے کے بعد یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا اور سوائے افسوس کے صفحۂ روزگار پر کچھ یادگار نہیں رہے گی۔ کنایہ تصریح سے بہتر ہے!''

''احقر کو منتظرِ جواب خیال فرمائیں۔ آپ جو کچھ بھی تحریر کریں گے، حرف بحرف انگریز صاحبان کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ فقط۔'' [ے]

اس تحریر کے ایک ہفتے بعد ۷/ اگست کو دہلی کے بارود کے کارخانے میں اچانک دھماکہ ہوا اور یہ خط حکیم احسن اللہ خاں پر انگریزوں سے ساز باز رکھنے کے پہلے ہی سے عائد الزام کا گویا ایک ثبوت بن گیا جس کا ردِ عمل انگریزوں کے ایک جاسوس کی رپورٹ میں یوں بتایا گیا ہے:

''کل بارود کے کارخانے میں جو دھماکہ ہوا، اس میں پانچ سو افراد ہلاک ہوئے۔ فوج کو حکیم احسن اللہ خاں پر شک ہے کہ یہ دھماکہ اس کے ایما پر کرایا

گیا۔ اس کے گھر کی تلاشی لی تو ان کو انگریزی کیمپ کے کسی منشی کا بھیجا ہوا خط ملا۔ اس سے باغیوں کو یقین ہو گیا اور انہوں نے حکیم احسن اللہ کا گھر جلا دیا۔ بادشاہ نے بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی۔''[۸]

منشی رجب علی نے مقتدر انگریزی حلقوں میں اپنے خط کا چرچا کروایا۔ گریٹ ہیڈ مشیرِ سیاسی متعینہ افواج دہلی نے ۱۵ر اگست کو جارج کارنک بارنس کے نام اپنے خط میں تحریر کیا:

''مولوی رجب علی نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں آپ کو اطلاع دوں کہ انہوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا، جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا، اور میرا یہ خیال تھا کہ اس سے کچھ ضرر نہ پہنچے گا بلکہ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے حکیم (احسن اللہ) بادشاہ اور باغیوں کے منصوبوں کے اندرونی راز بتانے کے قابل ہو جائیں۔ مولوی (رجب علی) کہتے ہیں کہ اس کے باعث حکیم کی سخت بے عزتی ہوئی۔ وہ مراسلہ سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا جنہوں نے ان کے مکان کی تلاشی لے ڈالی......''[۹]

اسی مراسلے کا ذکر اس کے دو روز بعد ۱۷ر اگست کو سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کے خط بنام رجب علی میں اس طرح ملتا ہے:

''تمہارا مراسلہ بنام حکیم احسن اللہ خاں وزیر شاہِ دہلی کی نقل، جو تم نے کمشنر اضلاع ستلج کو بھیجا، مجھے مل گیا۔ درحقیقت اس کا انداز اور تجاویز اس نوعیت کی تھیں کہ...... جب وہ مراسلہ باغیانِ دہلی کے ہاتھوں میں پہنچا ہوگا تو ان کے لئے اس قدر شدید دھچکے کا باعث ہوا ہوگا، گویا کہ بارود خانے میں دھماکے کا باعث وہی ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ فی الجملہ الجھن میں پڑ کر انہوں نے ایک دوسرے میں کُل اعتماد کھو دیا ہوگا۔''[۱۰]

انگریزوں نے منشی رجب علی پر اس کے خدمات کے صلے میں جو نوازشات کیں، وہ اس کی امید سے بہت کم تھیں۔ وہ ان سے کہیں زیادہ کا خواہشمند رہا، یہاں تک کہ دس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ''سٹار آف انڈیا'' کے تمغہ کا امیدوار ہوا۔ انڈیا آفس لائبریری کے

ریکارڈ میں ''ستارۂ ہند'' کے تمغہ کے حصول کے خواہشمندوں کے ذاتی کاغذات پر مشتمل چند فائلیں موجود ہیں۔ ہر فائل میں متعدد امیدواروں کی دستاویزات ہیں۔ منشی رجب علی کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۶۷ء میں اس تمغے کا خواستگار ہوا۔ اس کی عرضی کی پیروی لندن میں مقیم ''سید عبداللہ پروفیسر'' نامی ایک شخص کرتا رہا۔ سید عبداللہ کی طرف سے ۱۴ دسمبر ۱۸۶۷ء کی تحریر کردہ پہلی درخواست کا اندراج دفتر میں دو روز بعد ۱۶ دسمبر کو ہوا۔ بعد میں ایک اور درخواست محررہ ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء پر رجسٹری ڈیپارٹمنٹ انڈیا آفس کی اگلے روز یعنی ۱۱ مارچ کی وصولی کی مہر درج ہے۔ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی رجب علی کو اس سے پیشتر اس کی خدمات کے اعتراف میں انعام و جاگیر سے نوازا گیا تھا مگر وہ اس عطیہ سے مطمئن نہ تھا اور نہ ہی اس کے ہمدرد رفقا اسے تسلی بخش سمجھتے تھے، لہٰذا مزید نوازشات کے حصول کے لئے اس کی بھاگ دوڑ ایک عرصہ تک جاری رہی۔ اپنی عرضی میں وہ اس سلسلہ میں کی جانے والی مسلسل تگ و دو کا ذکر کرتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی مبینہ ''ناانصافی'' کے ثبوت میں وہ ایک ایسے خیر خواہ کی مثال پیش کرتا ہے جس کی کارگزاریاں اس کی خدمات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں مگر اسے بھاری جاگیر عطا کی گئی۔ وہ اپنی خیر خواہی اور جاں نثاری کے کارناموں کی ''قابلِ قدر'' اہمیت کو جتلا کر ان کے صلے میں حاصل کردہ جاگیر کو معمولی اور ناکافی قرار دیتا ہے۔ متذکرہ دستاویزات انگریزی میں ہیں جن میں سے چند ایک تو نقل مطابق اصل ہیں، باقی کا ترجمہ منشی رجب علی کے پیروی کنندہ سید عبداللہ نے اردو یا فارسی سے انگریزی میں کیا ہے اور یہ زیادہ تر اسی کے ہاتھوں کی تحریر کردہ ہیں۔ منشی رجب علی اپنی درخواست محررہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۷ء میں یوں عرض گزار ہے:

> ''۱۸۴۶ء میں سکھوں کے دائمی یادگار معرکہ کے دوران میں نے آنجہانی میجر جارج براڈفٹ صاحب بہادر کے ماتحت سرکار برطانیہ کے لئے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اہم واقعات کے اس دور میں اپنی جان اور مال سے یکساں قطع نظر جب بھی فرائضِ منصبی نے مجھ سے ان کی قربانی طلب کی، میں نے سر پر منڈلاتے ہوئے سخت خطرات میں ہر موقع پر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔

جاں نثاری کی اس کیفیت نے مذکورہ بالا ممتاز افسر کی نظرِ عنایت اس طرف مبذول کی اور انہوں نے سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کی موجودگی میں وعدہ کیا کہ وہ ۹ مواضع کی ایک جاگیر، جو میری موروثی جائداد تھی، مجھے عطا فرمائیں گے۔ مگر یہ وعدہ، جو سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کے دستخطوں سے توثیق کیا گیا تھا، میجر براڈفٹ صاحب بہادر کے افسوسناک انتقال کے باعث کالعدم ہو گیا۔ بعدازاں سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کی نوازش سے میں اس قابل ہوا کہ اپنا معاملہ اربابِ اختیار کی خدمت میں دوبارہ پیش کر سکوں۔ لازوال یادگار کے مالک کرنل سر ہنری منٹگمری لارنس صاحب بہادر نے بملاحظہ سرکار میرے حق میں رپورٹ تحریر کی۔ اس عرضی کے نتیجے میں موضع تلونڈی اور دوسرے مواضع، جو میری موروثی جائداد تھے اور جن کی سالانی جمع دو ہزار روپے تھی، بمع ایک اور موضع کے جسے اپنی سعی و کوشش سے آباد کیا تھا اور جس کی سالانہ جمع چار سو روپے تھی، مجھے اور میری آئندہ نسلوں کو دائمی طور پر عطا کئے گئے۔''

''آنجہانی سر ہنری لارنس صاحب بہادر اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ سرکار کو میرا معاملہ تاخیر سے پیش کئے جانے کے باعث مجھے میرے قوی اور جائز دعاوی کا شایانِ شان صلہ نہیں دیا گیا اور انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ انگلستان پہنچنے پر وہ میرے مفادات میں اضافہ کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔ موت نے اس قابلِ احترام محسن کو، جو میرے دوست بھی تھے، مجھ سے چھین لیا۔ جنرل برنارڈ صاحب بہادر، جنہوں نے دارالحکومت کے محاصرے کے دوران دہلی فیلڈ فورس کی کمان کی تھی، میری مستحکم خیرخواہی کے علاوہ مسلسل جانفشانی اور تندہی کے اتنے معترف تھے کہ انہوں نے مجھے مکمل یقین دلایا کہ یہ خدمات کسی صورت بھی صلہ کے بغیر نہیں رہیں گی، اور یہ کہ وہ بذاتِ خود میرے معاملے میں کیمپ میں کسی دوسرے فرد کی نسبت زیادہ دلچسپی لیں گے لیکن یہ عظیم قدرشناس وقت سے پہلے ہی ہیضہ کا شکار ہو کر میجر ہڈسن

صاحب بہادر اور مسٹر گریٹ ہیڈ صاحب بہادر کی طرح، جو جنرل برنارڈ صاحب بہادر کے میرے ساتھ مذکورہ بالا وعدے کے وقت موجود تھے، ہم سے قطع تعلق کر گئے۔ تسخیرِ دہلی کے بعد کرنل بچر صاحب بہادر نے مجھے ایک سند عطا کی اور ساتھ ہی سر جان لارنس بارٹ صاحب بہادر کے حضور، جب یہ ممتاز مدبّر انبالہ میں تھے، میری پُر زور سفارش کی۔ میری خدمات کے عوض مجھے جو انعام دیا گیا، وہ کونسل میں گورنر جنرل صاحب بہادر کے فرمان کی منسلک نقل سے ظاہر ہے۔ اس فرمان سے متعلق مجھے چند معروضات پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

''مجھے دائمی طور پر جو دو مواضع عطا کئے گئے، ان میں سے چار سو روپے سالانہ جمع کا ایک موضع دراصل اس سفارش کی بدولت عطا کیا گیا تھا جو حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر نے کرنل سر کلاڈ مارٹن ویڈ صاحب بہادر کو فرمائی، جنہوں نے میرا معاملہ ہز ہائی نس مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی خدمت میں پیش کیا۔ سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر کو اس صورتِ حال کا بخوبی علم ہے۔ یہ عطیہ میں نے جس وقت وصول کیا، ایک بنجر اراضی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ صرف اس پر صرف کردہ عظیم سرمایہ اور سخت محنت و استقلال کا نتیجہ ہے جو میں اسے پیداواری اور قابلِ رہائش بنانے میں کامیاب ہوا، اور اب یہ پچھلے اٹھارہ برس سے میرے قبضے میں ہے۔ آٹھ سو روپے سالانہ جمع کا تلونڈی کا دوسرا موضع، جو مجھے اور میرے وارثوں کو دائمی طور پر عطا کیا گیا ہے، میری قدیم جاگیر کا ایک حصہ ہے، لہٰذا میں بڑے ادب کے ساتھ گزارش کرتا ہوں کہ آنجہانی جنرل برنارڈ صاحب بہادر کے میرے ساتھ کئے گئے وعدے کے پیشِ نظر مجھے عطا کردہ انعام کسی طور بھی میری کارگزاریوں کے ہم پلہ نہیں ہے۔ اگر میں جان فشن خاں ولایتی کا حوالہ دوں تو اس کا ناکافی ہونا مزید نمایاں ہوگا۔ اس نے دہلی سے پہلے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا، کسی ایک لڑائی میں بھی شریک نہیں ہوا اور اس کے فرائض چند گھوڑ سواروں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں موجود رہنے تک محدود تھے،

لیکن اسے بیس ہزار روپے سالانہ جمع کی جاگیر عطا کی گئی۔ اس کے برعکس میں شب و روز سرکار کی خدمت میں مصروف رہا اور باغیوں کے خلاف میری جدوجہد دہلی میں ان کے سرغنوں کے لئے اس قدر اہمیت کی حامل تھی کہ انہوں نے ایک باضابطہ اعلان جاری کیا جس میں اس شخص کے لئے بیس ہزار روپے انعام کا وعدہ کیا گیا جو انہیں مولوی سید رجب علی خان بہادر کا سر لا دے۔''

''میں اپنے کئی معتمد ملازموں سے محروم ہو چکا ہوں جنہوں نے جاسوسوں کے طور پر کام کیا اور جو دشمن کے ہاتھوں میں پڑ کر یا تو سفاکانہ قتل کر دئے گئے یا بیدردی کے ساتھ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے گئے۔ خود میرے ساتھ باغیوں کے جھگڑے ہوتے رہے جن میں سے ایک مقابلے میں میرے چار سوار خطرناک حد تک زخمی کر دئے گئے اور میں انہیں چارپائی پر ڈال کر کیمپ میں لایا۔''

''آخر میں یہ عرض ہے کہ یہ میری تنہا اور بلاشرکتِ غیرے ذاتی جدوجہد اور اثر آفرینی کا باعث تھا کہ سابق بادشاہ دہلی خود سپردگی پر آمادہ ہوا،

اور یہ کہ اس کے بیٹے یعنی شہزادے کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کے حوالے کئے گئے،

اور یہ کہ سابق شاہ کے ہزاروں حامیوں سے، جنہوں نے تلواریں ہاتھوں میں لئے ہوئے مرنے کا عزم کر رکھا تھا، اسلحہ چھینا گیا۔

کرنل بیچر صاحب بہادر میرے اس تمام بیان کی سچائی کی تصدیق کریں گے۔''

''میں عاجزانہ واثق امید کا اظہار کرتا ہوں کہ سرکارِ انگلشیہ، جس نے اپنے خیرخواہ حامیوں کے کارہائے نمایاں کے اعتراف اور انہیں انعامات سے نوازنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، میرے دعاوی پر فیاضانہ غور فرمائے گی اور مجھے میری جدوجہد اور قربانیوں کے شایان انعام صلہ میں دے گی۔'' [۱۱]

منشی رجب علی نے اس درخواست کے ساتھ اپنے ''کارناموں'' کی تصدیق اور ان کے معاوضے میں حاصل کئے جانے والے انعام و اکرام کے ثبوت میں حکمرانوں اور انگریز

افسران کی درجِ ذیل اسناد پیش کی ہیں جن میں سے رجب علی کے نام گورنر جنرل کے فرمان محررہ ۱۸ جون ۱۸۵۸ء کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

''یہ دیکھتے ہوئے کہ مفسدہ شروع ہونے سے قبل حسب الطلب کیپٹن ہڈسن تم دہلی کے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے اور بعد ازاں کیپٹن موصوفؔ کے ماتحت کمانڈر انچیف کے میر منشی مقرر ہوئے اور تم نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض نہایت خاطر خواہ طور پر ادا کئے،

اور یہ کہ محاصرۂ دہلی کے دوران تم نے مستند خبروں کے فراہمی میں شاندار کارکردگی دکھائی،

اور یہ کہ بدلی سرائے کی مہم کے دوران بھی تم موجود تھے اور علاقہ کے زمینداروں کو اپنے مقاصد میں شریک کر کے ان کے جاسوسوں کے ذریعہ باغیوں کی روزمرہ نقل و حرکت کی اطلاعات فراہم کرتے رہے۔

مزید برآں یہ دیکھتے ہوئے کہ مقبرہ ہمایوں کے قریب شاہِ دہلی کی گرفتاری کے موقع پر اور دوسری صبح شہزادگان مرزا مغل، ابوبکر اور خضر سلطان کو حراست میں لئے جانے کے وقت تم میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود تھے، ☆

اور یہ کہ اس کے علاوہ تم نے متعدد اہم اور امتیازی خدمات سرانجام دی ہیں،

لہٰذا ۲۶۹۶ روپے جمع کی وہ جاگیر جو ۱۸۵۳ء میں تمہیں ضلع لدھیانہ میں جگراؤں کے قریب بطورِ ذیل بخشی گئی تھی کہ ۲۲۹۶ روپے تمہارے نام تاحیات اور ۴۰۰ روپے برائے نسلاً بعد نسلٍ ؛ ہماری کمال عنایت کے سبب اس جاگیر سے ۱۴۹۶ روپے تمہیں عمر بھر جاری رہیں گے اور ۱۲۰۰ روپے کی جاگیر نسلاً بعد نسلٍ

☆ درجِ بالا اصل فرمان فارسی میں لکھا گیا تھا جس کا انگریزی ترجمہ سید عبداللہ نے کیا اور یہاں اس انگریزی ترجمہ کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس فرمان میں جہاں بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کے وقت منشی رجب علی کا میجر ہڈسن کے ساتھ موقع پر موجود ہونے کا ذکر ہے، وہاں رجب علی نے صرف موجودگی کے بیان کو اپنی خدمات کے مقابلے میں کم تر سمجھتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی تردید کی ہے: (باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

تمہارے ان بیٹوں کے لئے ہوگی جو تمہارے اپنے خونی رشتے کے وارث ہوں۔
چیف کمشنر پنجاب کو ہدایت کردی گئی ہے کہ تمہیں اس فرمانِ عام کے ساتھ ایک خلعت مالیتی پانچ ہزار روپے پیش کی جائے۔ تم بلاشبہ اس اعلیٰ انعام کو اپنی آسائش اور بہبودی کا ذریعہ سمجھو گے جو تمہاری ان شاندار اور مؤثر کارگزاریوں کے عوض، جو تم سرکار کے لئے بجا لائے، عطا کیا گیا ہے اور اس فرمان کو اپنے دوستوں اور ہمسروں کے درمیان ذاتی فخر اور عزت کا باعث خیال کرو گے۔'' [۱۲]

رجب علی نے اپنی عرضی میں کرنل اے۔ بیچر کوارٹر ماسٹر جنرل کی جو سند محررہ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۷ء پیش کی ہے، وہ درج ذیل ہے:

''مجھے ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے جو میر منشی مولوی رجب علی خاں بہادر نے دہلی فیلڈ فورسز کی نقل و حرکت کے دوران تمام عرصہ فرسٹ ای۔ بی۔ فیوزیلیرز کے قائم مقام کوارٹر ماسٹر جنرل لفٹیننٹ ڈبلیو۔ ہڈسن کی براہِ راست ہدایات کے تحت محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے انجام دیں۔ مئی کے مہینے سے لے کر، جبکہ کرنال میں اس کی تشکیل ہوئی، موجودہ وقت تک مولوی رجب علی کی جدوجہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ وہ بڑے دشوار حالات میں بھی مصروفِ کار رہا ہے۔ اس نے تقریباً ہر روز شہر سے خطوط کے ذریعہ لگاتار مخبری کرتے رہنے کے علاوہ دشمن کی بیرونی حرکات و سکنات کے متعلق براہِ راست اور مستحکم جاسوسی جاری رکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولوی رجب علی نے سرکارِ ہند کے ساتھ قابلِ تعریف اور دیانتدارانہ جاں نثاری کے جس اعلیٰ کردار کا ہمیشہ مظاہرہ کیا ہے، وہ اس نے عظیم

(پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے): ''یہ ایک غلطی ہے۔ وہ میں ہی تھا جو سابق بادشاہ دہلی کو ہمایوں کے مقبرے سے لایا اور نصف راہ میں کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کی طرف گھوڑسوار دوڑائے۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھے اور میری طرف سے سابق بادشاہ کی سپراندازی کی اطلاع پر فوراً میرے ساتھ آملے۔ اس کے ثبوت میں کرنل بیچر صاحب بہادر اور کرنل برن صاحب بہادر کی اسناد منسلک ہیں۔ (مولوی سید رجب علی خان بہادر)''

آزمائش کے اس دور میں نہ صرف برقرار ہی رکھا بلکہ اس میں بے حد اضافہ کیا۔ میں اس کی کارگزاریوں کو سرکار کے ہمدردانہ ملاحظہ کے لئے پیش کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھوس اور مستقل انعام کی پُر زور سفارش کرتا ہوں۔ وہ فتح دہلی سے ہی بادشاہ کی خود سپردگی کے لئے آلۂ کار بنا رہا ہے اور ان تین شہزادوں کی گرفتاری کے لئے بھی، جو سرکار کے لئے انتہائی خطرناک تھے اور دہلی میں عیسائیوں کے بے رحمانہ قتلِ عام میں ملوث تھے۔ ان فرائض کی بجا آوری میں اس نے بہت سے ذاتی خطرات مول لئے۔ مجھے واثق یقین ہے کہ سرکارِ برطانیہ کے نیک مقاصد کی خاطر وہ اب بھی اپنی تلوار کو اتنا ہی استعمال کرنے کو تیار ہے جتنا کہ اپنا قلم۔" [۱۳]

اس کے علاوہ منشی رجب علی نے کرنل ایچ۔ پی۔ برن کے اس مراسلے کی نقل بھی، واس نے رجب علی کی فرمائش پر اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ جی۔ رکٹس کے نام ۲ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو تحریر کیا، اپنی درخواست کے ساتھ لف کی ہے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"حاملِ ہٰذا مولوی رجب علی خاں بہادر نے مجھے آپ کے نام یہ تحریر دینے کی درخواست کی ہے۔ ضلع لدھیانہ میں اپنے ایک جاگیردار کی حیثیت سے آپ اسے پہلے ہی جانتے ہیں۔"

"گزشتہ چار ماہ کے دوران اس نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں بڑی عمدہ خدمات انجام دی ہیں اور جدوجہد کے آخری مراحل میں بادشاہ اور اس کے بیٹوں کو پیش کرنے کا ذریعہ یہی تھا۔ بادشاہ کو اس نے بذاتِ خود پیش کیا۔"

"اس نے لاہور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے تحت وہ تمام عرصہ جبکہ میں وہاں ڈپٹی سیکرٹری تھا، ملازمت کی۔ سر ہنری لارنس کو، جن کا وہ پنجاب کی جنگ کے دوران معتمد (کانفیڈنشل) منشی تھا، اس پر بے حد اعتماد تھا۔ میرے علم میں سرکار کا کوئی مقامی اہلکار ایسا نہیں جس نے ملک کے لئے مولوی رجب علی سے بہتر خدمات انجام دی ہوں، اور مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوگی کہ اسے اس کا

مناسب انعام مل گیا ہے۔" [۱۴]

یہاں پر رجب علی کے دعوے کا موازنہ خود ہڈسن کے بیان سے کرنا غیر ضروری نہ ہوگا۔ وہ کمشنر سی۔ بی۔ سانڈرس کے نام بادشاہ کی گرفتاری کا قصہ بیان کرتا ہے۔ اس تذکرہ میں رجب علی کی شرکت کا حصہ یوں ہے:

"میں نے مرزا الٰہی بخش کو طلب کیا اور ان کی معرفت زینت محل اور ان کے والد سے سلسلۂ گفت وشنید جاری کیا...... تمام لوگ مقبرہ ہمایوں میں آ گئے۔ جس روز دہلی دشمنوں سے خالی ہوئی، اس دن شام کو مرزا الٰہی بخش یہ مژدہ لے کر میرے پاس آئے۔ اگلے روز صبح میں نے ان کو دوبارہ بھیجا۔ مولوی رجب علی اور گھوڑ سواروں کا ایک مختصر سا دستہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اپنے پچاس سپاہی اور بھیجے۔"

"مقبرے کے قریب مولوی رجب علی کی پارٹی پر حملہ ہوا اور چار گھوڑ سوار زخمی ہو گئے۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ یہ حملہ بادشاہ کی پارٹی کا نہیں بلکہ کچھ جذباتی قسم کے لوگوں کا تھا، اس لئے میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ بادشاہ کی گرفتاری میں کسی قسم کے پس وپیش سے کام لیا جائے، لہٰذا میں نے رسالدار مان سنگھ کو اٹھارہ جوانوں کے ساتھ مولوی رجب علی کے پاس بھیجا اور یہ حکم دیا کہ اگر بادشاہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جائے تو مجھے فوراً اطلاع دو اور جو شخص بھی مقبرے سے باہر جانے کی کوشش کرے، اسے گولی سے اڑا دو۔ میں موقع پر موجود رہا لیکن عمارتوں کی آڑ میں ہو گیا تا کہ نظر نہ آسکوں۔ مولوی رجب علی کو ہدایت دے دی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کو بتا دیں کہ اگر وہ خاموشی سے باہر آ کر خود کو حوالے کر دیں تو میں (ہڈسن) ان کی حفاظت کا ضامن ہوں لیکن اب اگر انہوں نے مقبرے سے فرار ہونے کا ارادہ کیا تو دروازے کی کمان میرے ہاتھ میں ہے، میں بغیر کسی رحم کے ان کو اور ان کے لواحقین کو گولی مار دوں گا۔"

"دو تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد رسالدار نے آ کر اطلاع دی کہ

بادشاہ آ رہے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی بذاتِ خود بادشاہ کی پالکی کے ہمراہ چل رہے تھے۔ بادشاہ کی پالکی کے بالکل پیچھے بیگم کی پالکی تھی۔ پھر بادشاہ کے بلازمین اور ان کے پیچھے قلعہ اور شہر سے بھاگے ہوئے پناہ گزینوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ پالکیاں رک گئیں اور بادشاہ نے یہ پیغام میرے نام بھیجا کہ وہ خود میری زبان سے اپنی جاں بخشی کے الفاظ سننے کے خواہشمند ہیں۔ میں اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر ادھر کی طرف بڑھا لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنے سپاہیوں کو بادشاہ کی پارٹی اور اس مجمع کے درمیان کھڑا کر دیا جو پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ بظاہر ان کے ارادے خطرناک معلوم دے رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر فوراً بادشاہ اور بیگم کے قریب پہنچ گیا۔ جو عہد میں نے ان سے کیا تھا اس کی بابت دونوں احتجاج اور خوف کا مظاہرہ کر رہے تھے کیونکہ میں نے ان سے یہ شرط لے لی تھی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کریں گے، جس کا کہ اس وقت پورا امکان تھا۔ پھر میں نے خاصی بلند آواز میں، ایسے کہ سب سن سکیں، اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جو شخص اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کرے، گولی مار دینا۔ جیسے ہی وہ مجمع سے کچھ اور دور آ گئے، میں نے مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی سے بادشاہ کی پالکیوں کے ساتھ ساتھ چلنے کو کہا اور اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کی پالکی کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اس کے ایک گھنٹے بعد مجھے اس وقت اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا جب میں نے بادشاہ اور بیگم کو میجر جنرل کے احکام کے مطابق قلعہ کے دروازے پر آپ (کمشنر سانڈرس) کے حوالے کر دیا۔'' [۱۵]

''......بادشاہِ دہلی نے اس شرط پر خود کو میرے حوالے کیا کہ ایک تو ان کی جاں بخشی کر دی جائے اور دوسرے یہ کہ ان کی شان میں کوئی گستاخانہ سلوک نہ کیا جائے گا۔ میرے نام سے یہ وعدہ مرزا الٰہی بخش کے ذریعے ایک روز قبل بیگم زینت محل اور ان کے والد (احمد قلی خاں) سے بھی کیا جا چکا تھا اور گرفتاری والے

دن مولوی رجب علی نے دوبارہ یہی وعدہ (میری طرف سے) بادشاہ سے کیا۔ بعد ازاں بادشاہ کے اصرار پر مجھے بھی بزبانِ خود اُن الفاظ کو دہرانا پڑا۔'' [۱۶]

کمشنر دہلی سی۔ بی۔ سانڈرس بادشاہ کی گرفتاری کے دو روز بعد ۲۲ ستمبر کو ولیم میور کے نام لکھتے ہیں:

''میں یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ کیپٹن ہڈسن اور مولوی رجب علی کی کوششوں سے دہلی کا بادشاہ اس واحد شرط کے تحت اسیری قبول کرنے پر آمادہ ہوا کہ اس کی اور بیگم زینت محل کی جاں بخشی کردی جائے گی۔'' [۱۷]

کیپٹن ہڈسن نے اپنے بھائی کے نام ایک خط میں شہزادوں کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مہم میں رجب علی کی شرکت کا یوں تذکرہ کیا ہے:

''میں صبح سویرے ہی ایک سو منتخب آدمیوں کو لے کر شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی جانب چلا جہاں ان بدمعاشوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ میں نے مقبرے تک جانے کی رسائی یا وہاں سے کسی کے بچ نکلنے کی کاٹ کا منصوبہ بنایا اور پھر شاہی خاندان کے ایک کم مرتبہ رکن (جسے اس کی جاں بخشی کے وعدہ پر خرید لیا گیا تھا) اور یک چشم مولوی رجب علی کو یہ بتانے کے لئے (مقبرے کے) اندر بھیجا کہ میں شہزادوں کو سزا دینے کے لئے گرفتار کرنے آیا ہوں اور میرا عزم ہے کہ انہیں زندہ یا مردہ گرفتار کروں۔ دو گھنٹوں کے لفظی نزاع اور شدید تشویش کی کیفیت کے بعد وہ سامنے آئے اور پوچھا کہ کیا گورنمنٹ نے ان کی جاں بخشی کا وعدہ کیا ہے؟ اس پر میں نے جواب دیا کہ 'ہرگز نہیں' اور انہیں ایک گارد کی حفاظت میں مقبرے سے شہر کی جانب روانہ کردیا۔'' [۱۸]

اور پھر شہر میں پہنچ کر ہڈسن ہی کے بقول ''میں نے اپنے ایک آدمی سے قرابین پکڑی اور سوچتے سمجھتے ہوئے انہیں ایک ایک کر کے گولی سے اُڑا دیا''۔ [۱۹] یوں رجب علی کے پیش کردہ شکار ہڈسن کے ہاتھوں کسی کارروائی کے بغیر اپنے انجام کو پہنچے۔ رجب علی کی پیش کردہ اسناد میں اس کے اس ''کارنامے'' کا حوالہ بھی بڑے کرّ و فر کے ساتھ موجود ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ لندن میں رجب علی کی طرف سے پہلی درخواست کا اندراج دفتر میں ۱۶ دسمبر ۱۸۶۷ء کو کیا گیا اور اس کے بعد دوسری درخواست ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء کو دائر ہوئی۔ اس عرصہ کے دوران کے ایک فرمان جاری کردہ وائسرائے و گورنر جنرل ہند سر جان لارنس بنام رجب علی محررہ ۳۱ راگست ۱۸۶۸ء کی نقل فائل میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً پہلی درخواست کے نتیجہ میں رجب علی کو دی گئی جاگیر کا وہ حصہ جو اُسے صرف تا حیات عطا کیا گیا تھا، اب وہ اسے دائمی طور پر مرحمت کر دیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

''تمہاری ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، جو تم نے بعض اہم مواقع پر ملک کے لئے انجام دیں، یعنی:

برطانوی افواج کے افغانستان جانے کے لئے برائے حصولِ اجازت عبور سکھ سرحد حاکمِ پنجاب سے گفت وشنید کے وقت،

ان مہمات میں جو پنجاب کے برطانوی عملداری میں شمولیت کا باعث ہوئیں،

اور ۱۸۵۷ء کے محاصرۂ دہلی کے دوران،

۲۶۹۶ روپے سالانہ جمع کی ایک جاگیر، جس میں سے ۱۵۲۱ روپے کی رقم دوامی عطیہ ہے اور بقایا صرف تا حیات، تمہیں مرحمت کی جا چکی ہے، اب مذکورہ بالا کارکردگیوں کے پیشِ نظر برائے منظوری مزید انعام ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی سفارش پر اس کی بجائے مذکورہ کل جاگیر تمہیں دائمی طور پر عطا کی جاتی ہے۔ اس عطیہ کے بدلے تمہیں سرکارِ برطانیہ کے ساتھ اپنی خیر خواہی کا ہمیشہ ثبوت دینا چاہیے۔'' [۲۰]

متذکرہ فائل میں سابق کمشنر دہلی مسٹر ہملٹن کے نام فارسی میں رجب علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک عرضی محررہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۷ء، جس کا عکس زیرِ نظر مقالہ میں شامل ہے، اس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

''دریائے علم را گوہر نایاب و سپہر اقبال را آفتاب جہانتاب، مرجع علم و فضلاء متبحرین محرز قصبات السبق حکماء دوربین جناب معلی القاب دام اقبالہم''

''خدمتِ عالی میں گزارش ہے کہ مشفقی سید عبداللہ شاہ کی تحریر سے احقر کے متعلق

حضور ہملتن صاحب بہادر 78

دام اقبالہم
جناب معلی القاب

دریای علم را گوهر نایاب سپهر اقبال را آفتاب جهانتاب مرجع علما و فضلای متبحرین محرز قصبات السبق حکما و دوربین

خدمت با عظمت میرساند

که از تحریر منشفقه عبیدالله توجهات و التفات و عنایات آنجناب نسبت خود دریافته سجده شکر بارگاه
باری ادا کردم که این ذره بیقدر را بندگان حضور هنگام رونق افروزی خود بدیار فسیح الفضای
لندن فراموش نفرموده اند بلکه برای فلاح و بهبود بنده با وجود کثرت اشتغال توجه دارند حقیقت
اینست که خدمات این ذره بیمقدار از عهد فرمان فرمای کشور عدل و انصاف و مروت و دانش
و فتوت و علم و فضل سر جارج رسل کلارک صاحب بهادر دام اقبالهم در ملک محفوظه این روی دریای
ستلج و کوهستان و لاهور و حاضر بودن بحضور آنجناب در عهد کرنیل سر هنری منتگمری لارنس
صاحب بهادر بمقدمه تحقیقات جرم مولراج ناظم ملتان و در هنگامه سنه ۱۸۵۷ع موجود بودن در عین کارزار
بمقابله اضطراب آتش بار و آوردن بادشاه کوتاه اندیش دهلی بحضور صاحبان [illegible] ظفر امواج
و مقابله بودن بسیف و سنان و مجروحی پنج سوار همراهی خود و مامور شدن بحکم ویسرای گورنر
جنرل عالی تبار بدوهی فیتس پیشترک صاحب بهادر در مقدمه ڈیسمبر و غیره حالاتیکه از دفتر گورنری
و لاهور و انباله و دهلی ظاهر و خطوط انگریزی صاحبان عالیشان بران شاهد صادق و الحمد لله که
درین وقت حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بهادر و سر فریدرک کری بارنٹ صاحب بهادر
و ماتل صاحب بهادر و خصوص آنجناب رفیع الالقاب بدربار دربار ملکه مقدسه انگلستان خلد الله ملکها
و سلطانها موجود اند و عند الاستفسار هرچه واقعی است بنظر انصاف از شرح و بسط آن
دریغ نخواهند فرمود و پس مقام غور است که اقراری که بابت عطای محل جاگیر موروثی بنده
براڈفوت صاحب بهادر کرده اند و سر فریدرک کری بارنٹ صاحب بهادر که اگر در معرکه سنگهان لاهور

تا هست قدمی و تندابیر مستحکمه نمی فرمودند تمام کشور بخارا از دست سرکار انگریزی بدر می رفت
و شورشی عظیم برپا می شد تصدیق خود بر اقرار برادر فوت صاحب بهادر ان شنوم من تنخواه خود نرسیدم
و دفتر انگریزی حالش واضح است و در آن وقت رازها و اسرارها که صاحب ممدوح سپرد
بنده کردند تا امروز هم بزبان نیاورده و صاحب ممدوح در خط انگریزی خود اشاره بآن کرده اند
و نزدم موجود و بیشک صاحب ممدوح الصدر عند الاستفسار خود بیان خواهند نمود هرگاه چنین صاحبان
عالیشان مربی خود و گواه خود دارم و از قاف تا قاف عدالت سرکار انگلیشیه مشهور است دل خاکسار
چرا از تصور این امور پاش پاش نگردد و دیده جیحون و جگر خون چگونه نشود ملاحظه برای این نکردم
که عمر نوح و خزانه قارون و گریه ایوب و صبر یعقوب از کجا پیدا کنم و دنیای دنی را گاهی بنظر
نیاورده ام و هرچه بدست آمد در بنای مساجد و چاهات فی سبیل الله و خیرات براه خدا صرف
کردم این امر از غایت شهرت محتاج بدلیل نیست پس اگر بسبب انتخاب اندک نظر توجه وزیر اعظم
کشور انگلستان بحالم شود بمقصود خود خواهیم رسید ورنه بقول شاعر زبان شکوه نداریم و دست دامنگیر
داستان بنده دراز است زیاده ازین طول نکردم که موجب ملال مزاج همایون نگردد مختصر این است
که قبل ازین هم خدمات سرکار بجانفشانی کرده ام و آنوقت عمرم زیاده از شصت سال است
تا زنده ام بجان حاضرم و دعای ترقی ملک و دولت سرکار سپهر اقتدار انگلیشیه و صاحبان قدر
افزا و عنایت فرمای خود می کنم قلم شکستم و مضمون مختصر کردم که بیرون از ادب گفتگوی طولانی
آفتاب اقبال تابان باد

عریضه ۲۲ سپتمبر ۱۸۷۲
[illegible] عفی عنه
متعلم [illegible] ضلع لدهیانه

آنجناب کی توجہات، التفات اور عنایات کا جان کر میں بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر بجالایا کہ آپ نے مجھ ناچیز کو لندن کے شاہی دربار میں شرفیابی کے وقت بھی یاد رکھا اور کثرتِ مشاغل کے باوجود میری فلاح و بہبود پر توجہ فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احقر کی خدمات سر جارج رسل کلارک صاحب کے دَور سے دریائے ستلج، کوہستان اور لاہور کے اس پار کے علاقے میں اور سر ہنری منٹگمری لارنس صاحب بہادر کے عہد میں، ملتان کے ناظم مولراج کے تفتیشی مقدمے میں، آنجناب کی خدمت میں میری حاضری اور ۱۸۵۷ء کے فساد میں میرا عین میدانِ جنگ میں آگ برساتی ہوئی توپوں کے سامنے رہنا اور دہلی کے کوتاہ بادشاہ کا انگریز صاحبان کے مقابلے پر آنا، تلواروں اور نیزوں سے لڑائی ہونا اور اپنے پانچ ساتھی سواروں کے ساتھ میرا زخمی ہونا اور وائسرائے گورنر جنرل کے حکم پر ...... جاگیر ...... عطا ہونا ...... یہ حالات گورنر، لاہور، انبالہ اور دہلی کے دفتروں کے کاغذات میں موجود ہیں اور انگریز صاحبانِ عالیشان کے خطوط اس کے گواہ ہیں۔ الحمدللہ کہ اس وقت سر جارج کلارک صاحب بہادر اور سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر، مانسل صاحب بہادر اور بطورِ خاص آنجناب رفیع الالقاب بنفسِ نفیس ملکۂ مقدسہ انگلستان خلداللہ ملکہا و سلطانہا کے دربار میں موجود ہیں اور دریافت کرنے پر انصاف کی نظر سے حقیقتِ حال کی وضاحت و تشریح میں دریغ نہیں فرمائیں گے۔ پس مقامِ غور ہے کہ براڈفٹ صاحب بہادر نے میری کُل موروثی جاگیر کے اعطا کے ضمن میں اقرار کیا اور اس کی تصدیق سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر نے بھی کی۔ وہ اگر لاہور میں سکھوں کی لڑائی کے دوران ثابت قدمی اور پختہ تدبیری کا مظاہرہ نہ کرتے تو پورا ملک پنجاب انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جاتا اور بہت زیادہ شورش برپا ہوتی۔ اس سب کچھ کے باوجود مجھے میرا حق نہیں ملا۔ انگریزی دفتر میں اس کا حال واضح ہے۔ اس وقت جو راز و رموز صاحب ممدوح نے مجھ سے

کبھی، آج تک میری زبان پر نہیں آئے ہیں اور صاحب ممدوح نے اپنے انگریزی خط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو میرے پاس موجود ہے اور بیشک صاحب ممدوح دریافت کرنے پر بتا دیں گے۔ جب ایسے عالیشان صاحبان میرے سرپرست اور گواہ ہیں اور انگریزی حکومت کے عدل و انصاف کی شہرت بھی اطراف و اکنافِ عالم میں پھیلی ہوئی ہے تو خاکسار کا دل ایسی باتوں کے خیال سے پاش پاش کیوں نہ ہو، آنکھیں جیحوں کیسے نہ ہوں اور جگر خون کیوں نہ ہو! میں نے مقدمہ اس لئے دائر نہیں کیا کہ عمرِ نوح، خزانۂ قارون، گریۂ ایوب اور صبرِ یعقوب کہاں سے لاؤں؟ دنیائے دنی کو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ جو کچھ بھی میں نے کمایا، مسجد اور کنوئیں بنوانے اور خیرات فی سبیل اللہ میں لگا دیا۔ یہ بات اتنی معروف ہے کہ کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اگر آپ کی ادنیٰ سی کوشش سے وزیرِ اعظم انگلستان کی معمولی سی توجہ میرے حال پر ہو جائے تو میں اپنی مراد پالوں گا، ورنہ بقولِ شاعر:

زبانِ شکوہ نہ داریم و دستِ دامن گیر

(نہ میری شکوہ کرنے والی زبان ہے اور نہ دامن پکڑ لینے والا ہاتھ)

میری کہانی بہت لمبی ہے۔ میں نے طویل بات نہیں کی کہ باعثِ ملال نہ ہو۔ مختصر یہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی سرکاری خدمات انجام دی ہیں اور اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا ہوں۔ جب تک زندہ ہوں، میری جان حاضر ہے۔ دعائیں.......................................

قلم شکستم و مضمون مختصر کردم ۔۔۔ کہ نیست طرزِ ادب گفتگوئے طولانی

آفتابِ اقبال تابان باد!

سید رجب علی عفی عنہ

معروضہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۷ء

بمقام جگراؤں ضلع لدھیانہ'' [۲۱]

اس عرضی کے مندرجات اس لحاظ سے خاصے دلچسپ ہیں کہ ان میں انگریزوں کے شعبۂ جاسوسی کا یہ ''نامور'' اور کامیاب ترین اہلکار جہاں ایک جانب ''برائے استحکام سرکار انگریزی'' اپنے ہی عوام کے خلاف گہری سازشوں میں ملوث نظر آتا ہے، وہاں دوسری جانب وہ اپنی تمام کمائی رفاہِ عامہ کے کاموں، مساجد اور کنوؤں کی تعمیر اور خیراتی مقاصد میں صرف کر دینے کا دعویٰ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نظیر لدھیانوی لکھتے ہیں:

''مقبرہ ہمایوں کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو مولوی رجب علی اور ان کے خاندان سے عقیدت کم ہوگئی تھی، تاہم مولوی رجب علی نے تلافیٔ مافات کے طور پر دہلی کے ستم رسیدہ لوگوں کی حتی الامکان امداد کی۔'' [۲۲]

فلاح و بہبود کے اس کام میں انہماک کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما تھا؟ تلافیٔ مافات، عوام میں کھوئی ہوئی عزت اور وقار کی بحالی یا کچھ اور؟ یہ بات البتہ طے ہے کہ وہ تلافیٔ مافات کے احساس سے قطعی عاری تھا کیونکہ ''خدماتِ فرنگ'' کے سلسلے میں اپنی سابقہ کارگزاریوں کا فخریہ اظہار اور اس عالمِ پیری میں بھی ان کے لئے اپنی ''جان حاضر'' کے دعوے کی برقراری اس کے ذہن اور کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس موقع پر منشی رجب علی کی درخواست کے لندن میں مقیم پیروی کنندہ سید عبداللہ کا تعارف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ''تاریخ اودھ'' (جلد دوم) کے مطابق:

''سید عبداللہ کے والد کا نام سید محمد خان بہادر تھا...... ۱۸۵۷ء میں سید محمد نے انگریزوں کے ساتھ بڑی ہمدردی کا برتاؤ کیا اور اُن کے ساتھ بڑی وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس کے صلے میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور گراں قدر پنشن عنایت کی گئی...... سید عبداللہ پہلے محافظ دفتر سفارت کلکتہ تھے، بعد میں کسی طریق سے ایک انگریز کے ساتھ لندن پہنچ گئے۔ وہاں کے رئیس ازراہِ جوہر شناسی عزت کے ساتھ پیش آئے۔ مناسب صورتِ معاش بھی نکل آئی۔ چند روز کے بعد ایک ولایتی عورت سے، جو کسی پادری کی بہن اور ایک افسرِ فوج کی بیٹی تھی، بعد ایجاب مذہب مسیحی شادی ہوئی کیونکہ عقد شرعی مذہب عیسائی اختیار کئے بغیر

نہیں ہو سکتا تھا۔'' [۲۳]

فرانسیسی مستشرق موسیو گارساں دتاسی، جنہوں نے سرسید احمد خاں کی مشہور تصنیف۔ ''آ ثار الصنادید'' کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے اسے یورپ گیر شہرت عطا کی تھی، اپنے ایک خطبے میں سید عبداللہ کو یونیورسٹی کالج لندن میں ہندوستانی زبان کا پروفیسر بتایا ہے۔ [۲۴] انہوں نے واقعہ ۱۸۵۷ء کے دوران انگریزوں کے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ کے تعارف میں اس کی انگریز دوستی اور انگریزی دانی میں ان کی مہارت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''......بعض ہندوستانی، جو عملی طور پر کچھ کرنے سے قاصر رہے، انہوں نے کھلم کھلا مصیبت زدہ (انگریزوں) سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک شخص سید عبداللہ نامی ہے جو بیوہ ملکہ اور شہزادگانِ اودھ کے ساتھیوں میں سے ہے۔ جب اس کو جنرل ہنری لارنس کی مرگ کی خبر معلوم ہوئی، جو اِس غدر کے ایک معرکے میں ہلاک ہوا، تو اس نے ایک اردو مثنوی لکھ کر شائع کی۔ عبداللہ ایک زمانے میں پنجاب کے کسی انگریزی دفتر میں مترجم رہ چکا تھا اور لارنس سے خاص طور پر واقف تھا۔ اس نے اسی نظم کا مختصر ترجمہ خود نظم انگریزی میں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس روانی کے ساتھ انگریزی زبان لکھنے پر قادر تھا۔'' [۲۵]

گارساں دتاسی ۱۸۷۰ء میں لکھے گئے اُپنے ایک مقالے میں تحریر کرتے ہیں:

''اِس وقت جو مسلمان لندن آتے ہیں، ان کی رہبری سید عبداللہ کرتے ہیں جو نہایت دلچسپ اور پُر مذاق آدمی ہیں۔ ان کی بدولت مسلمان نوجوانوں کو ایک رہنما مل جاتا ہے جو اُن کو انگریزوں کی اعلیٰ سوسائٹی میں ملنے جُلنے کے آداب سے واقف کرا سکتا ہے۔'' [۲۶]

گارساں دتاسی سرسید کے نام ایک خط میں اس شخص کا تذکرہ ''میرا دوست سید عبداللہ'' کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ [۲۷] سرسید نے بھی اپنے لندن کے قیام کے دوران

کیمبرج یونیورسٹی کی سیر کی تفصیل میں ''اپنے دوست سید عبداللہ'' کی ہمراہی کا ذکر کیا ہے۔ [۲۸]
خواجہ الطاف حسین حالی نے سرسید کی سوانح حیات میں ''ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبداللہ نام'' کے اس طویل مضمون کے ایک اقتباس کا ترجمہ درج کیا ہے جو انہوں نے ۱۸۷۰ء میں سرسید کی لندن سے واپسی کے بعد وہاں کے ایک انگریزی اخبار میں چھپوایا تھا اور جس میں سرسید کی لیاقت اور شائستگی کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ [۲۹]

آخر میں نمونے کے طور پر منشی رجب علی کی ان اطلاعات سے، جو اس نے اپنے انگریز آقاؤں کو مہیا کیں، چند اقتباسات ''غداروں کے خطوط'' سے نقل کئے جاتے ہیں۔ ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رجب علی اپنے ماتحت تراب علی، گوری شنکر اور دیگر مشہور اور غیر مشہور انگریزی جاسوسوں کی مہیا کردہ خبریں اور ذاتی طور پر حاصل کی گئی معلومات براہِ راست اپنی ہائی کمانڈ کو بھیجتا تھا۔

۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء:

''۴۷ ویں اور ۵۴ ویں رجمنٹوں کے پاس پانچ سو من بارود کا ایک علیحدہ ذخیرہ موجود ہے جو وہ کسی دوسری رجمنٹ کو دینا نہیں چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ بارود کا یہ ذخیرہ انہوں نے اپنے استعمال اور حفاظت کے لئے جمع کیا تھا، اس پر کسی دوسری رجمنٹ کا حق نہیں...... یہاں پر تقریباً چار سو من کچا گندھک موجود ہے لیکن صاف کئے ہوئے گندھک کا کوئی ذخیرہ شہر میں موجود نہیں۔'' [۳۰]

۲ اگست ۱۸۵۷ء:

''باغیوں کا فوجی دستہ محاذ سے اب واپس پہنچا ہے۔ یہ وہ دستہ ہے جس نے شام کو آٹھ بجے کے قریب دوسرے سپاہیوں کے ساتھ مل کر ہمارے مورچوں پر حملہ کیا تھا...... اب صبح کے دس بجے ہیں۔ انہوں نے ہندوراؤ کے گھر اور باولی کے مورچوں کو چھوڑ کر سبزی منڈی کے مورچوں پر توجہ دینی شروع کی ہے ...... ہماری فوج کے تقریباً پندرہ افراد ہلاک اور زخمی ہوئے جبکہ دشمن کا نقصان اس سے بہت زیادہ ہوا۔ ان کی صحیح تعداد کی اطلاع بعد میں دی جائے گی۔

باغیوں نے اپنے حملے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ فوج کا ایک دستہ چار گھنٹے تک محاذ پر جا کر لڑتا ہے اور بگل کی آواز پر واپس دہلی آ جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک دوسرا دستہ لے لیتا ہے۔ اس طرح لڑائی متواتر جاری رہتی ہے اور باغیوں کی تمام فوج جنگ میں باری باری حصہ لیتی رہتی ہے۔'' [۳۱]

۱۲/اگست ۱۸۵۷ء:

''ہرکاروں نے کل شام آ کر اطلاع دی کہ شہر کے ہر دروازے پر پہرہ لگا دیا گیا ہے اور کسی شخص کو گزرنے کی اجازت نہیں، جب تک کوئی اس کو جانتا نہ ہو یا محلہ کا کوئی شریف آدمی اس کی سفارش نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کل شام سے کوئی اطلاع نہیں بھیج سکا اور نہ ہی آپ کا کوئی ہرکارہ مجھ تک پہنچا ہے۔۔۔ بارہ تاریخ کو جو توپیں پکڑی گئی تھیں، ان میں سے ایک توپ کے گولے کو جب کھولا گیا تو پتہ چلا کہ اس میں نیا بارود بھرا گیا تھا۔ یہ بارود کافی خام اور کم درجے کا ہے۔ اس سے ان اطلاعات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کے پاس اچھے بارود کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور روزانہ استعمال کے لئے جو بارود بن رہا ہے، وہ بالکل بیکار ہے۔ ان کے پاس گندھک کا جو ذخیرہ موجود ہے، وہ عنقریب ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ اس قسم کا بارود بھی نہ بنا سکیں گے۔'' [۳۲]

۲۹/اگست ۱۸۵۷ء:

''تراب علی ایک دو دن کے لئے انگریزی کیمپ میں گیا ہوا ہے، اس لئے اس کی فراہم کردہ اطلاعات آج میں آپ کو ارسال نہیں کر سکوں گا۔ اس کے واپس آنے پر یہ اطلاعات بھیج دی جائیں گی ...... کل عورتوں اور بچوں سے لدی ہوئی بائیس گاڑیاں دہلی دروازہ کے ذریعے بلب گڑھ اور ریواڑی کی طرف روانہ ہوئی تھیں۔ اتنی ہی تعداد روزانہ یہاں سے چلی جاتی ہے۔'' [۳۳]

۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء:

''میں آپ کے حکم کی تعمیل میں خبریں حاصل کرنے کے لئے شہر کی فصیل کے

قریب گیا تھا۔ یہاں پر زخمی سپاہیوں سے لدی ہوئی بیشمار ڈولیاں موجود تھیں ...... انگریزی جھنڈا کشمیری دروازے کے اوپر لہرا کر انگریزی فوج کی فتح کا اعلان کررہا ہے۔ سنا ہے کہ باقی فوج کے سب دستے قطب صاحب جانے والی سڑک اور دوسرے راستوں سے ریواڑی کی طرف بھاگ رہے ہیں لیکن اجمیری دروازے کے قریب اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد موجود ہے...... شہر میں دہلی دروازے تک باغیوں کی کوئی زیادہ تعداد موجود نہیں ...... کشمیری دروازہ پر حملہ کرنے کے دوران ہمارے تقریباً ایک سو پچاس آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے ...... اس حملے کے دوران تقریباً دو ہزار باغی ہلاک اور تقریباً ایک ہزار زخمی ہوئے تھے۔ آج کے حالات کی تفصیلات ابھی نہیں ملیں۔'' [۳۴]

حوالہ جات

۱۔ بہادر شاہ ظفر اپنے مقدمے میں بیان کرتا ہے کہ ''باغی فوجیں مجھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی تھیں مگر میں نہ گیا''۔ (مقدمہ بہادر شاہ ظفر، الفیصل لاہور [۱۹۹۰ء] ص ۱۶۳)

۲۔ Eye-witnesses to the Indian Mutiny (James Hewitt), Osprey Publishing Ltd., Berkshire. (1972), p.38

۳۔ ۱۸۵۷ء (غلام رسول مہر) کتاب منزل لاہور (۱۹۶۰ء)، ص ۱۳۷۔۱۳۸

۴۔ Delhi in 1857 (N.K.Nigam),S.Chand & Co. Delhi.(1957), p.99

۵۔ تحقیقاتِ چشتی (نور احمد چشتی) پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور (۱۹۶۴ء)، ص ۱۸ تا ۲۲

۶۔ غداروں کے خطوط (مرتبہ: سلیم قریشی/ عاشور کاظمی) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی (۱۹۹۳ء)، ص ۱۱۲

۷۔ تاریخ بغاوتِ ہند/ محاربۂ عظیم (پنڈت کنہیا لال) مطبع منشی نول کشور لکھنؤ (۱۹۱۶ء)، ص ۳۸۳۔۳۸۴

۸۔ غداروں کے خطوط، ص ۱۲۳

۹۔ محاصرہ دہلی کے خطوط، مطبوعہ دہلی (۱۹۴۰ء)، ص ۲۱

۱۰۔ انڈیا آفس ریکارڈز فائل نمبر L/P&S/15/73، ورق 775

۱۱۔ ایضاً، ورق 778

۱۲۔ ایضاً، ورق 779

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ بہادر شاہ ظفر (اسلم پرویز) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی (۱۹۸۶ء)، ص ۲۱۴ تا ۲۱۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۱۱

۱۷۔ Records of the Intelligence Department (Sir William Muir), T. & T. Clark, Edinburg (1902). Vol.I, p.123

۱۸۔ Twelve Years of a Soldier's Life in India (George H.Hodson), John W.Parker, London, (1859) p.300-302

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۲۰۔ انڈیا آفس ریکارڈز فائل نمبر L/P&S/15/73، ورق 775

۲۱۔ ایضاً، ورق 783

۲۲۔ داستانِ غدر (ظہیر دہلوی) اکادمی پنجاب لاہور (۱۹۵۵ء)، ص ۱۶۲

۲۳۔ افکار، کراچی، خصوصی نمبر برطانیہ، ص ۲۰۷

۲۴۔ خطبات گارساں دتاسی (حصہ اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۹ء)، ص ۳۹۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۲۶۔ مقالات گارساں دتاسی (جلد اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۴ء)، ص ۵۶

۲۷۔ خطوط بنام سرسید (شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۹۵ء)، ص ۲۰

۲۸۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ (۱۳ جنوری ۱۸۷۱ء) ص ۱۸

۲۹۔ حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کانپور (۱۹۰۱ء) حصہ اول، ص ۱۶۴

۳۰۔ غداروں کے خطوط، ص ۱۱۲

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵۔۱۱۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۸۹

ضمیمہ:

اسباب بغاوتِ ہند کے پسِ پردہ

نام میرا تھا، کام اُن کا تھا (سر سید)

۱۸۵۷ء کے واقعات پر سر سید احمد خاں نے سب سے پہلے ''سرکشی ضلع بجنور'' تحریر کی۔ یہ کتاب ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک طرف ضلع بجنور میں برپا ہونے والے واقعات کی تاریخ ہے اور دوسری طرف بحیثیت صدر امین ان کی وفادارانہ کارکردگیوں کے باعث ان کے ساتھ پیش آنے والے مصائب کا ذاتی تذکرہ بھی ہے۔ اگلے سال یعنی ۱۸۵۹ء میں ان کی تالیف ''اسباب سرکشی ہندوستان کا جواب مضمون'' طبع ہوئی جو بعد میں ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ کتاب صرف حکام کے مطالعہ کے لئے شائع کی گئی، اس لئے عوام الناس اس کے مندرجات سے کئی برس تک قطعی طور پر لاعلم رہے۔ پھر ۱۸۶۰ء میں انہوں نے ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' (رسالہ خیر خواہ مسلمانان) کے نام سے رسائل شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں انگریزوں کے لئے اپنی جان اور اپنے مال قربان کردینے کی پروانہ کرنے والے خیر خواہ مسلمانوں کے فرداً فرداً ''مستند'' حالات اردو اور انگریزی میں درج کئے جاتے تھے۔ اس کی ابتدا انہوں نے سب سے اول اپنی وفاداریوں کے تذکرے سے کی اور ثبوت کے طور پر حکام انگریزی کی اسناد بھی پیش کیں۔ یہ سلسلہ ۱۸۶۱ء میں تیسرا رسالہ طبع ہونے کے بعد منقطع ہوگیا۔ اس دوران انہوں نے اردو اور انگریزی میں چند ورقی کتابچہ

''شکریہ مراد آباد کے مسلمانوں کا'' شائع کیا جو دراصل ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء کو منعقد کئے گئے ایک جلسے میں انگریز حکام کے حق میں خدا تعالیٰ کے حضور پیش کی گئی ان کی دعائے شکرانہ تھی۔

متذکرہ بالا تالیفات میں ''اسباب بغاوتِ ہند'' نے خوب خوب شہرت پائی۔ انگلستان کی پارلیمنٹ میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور اس کے مندرجات پر مباحث ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی سے پاک و ہند کے اکثر قلمکاروں کی تحریروں میں اسے سرسید کے تدبر اور ان کی ہمت و جرأت کی مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اور بعض حلقے اس رسالے کی اہمیت کو غیر معمولی طور پر اجاگر کرنے کے لئے عوام و خواص میں اس امر کی تشہیر کرتے ہیں کہ اس سے متاثر ہو کر حکومت نے فوری طور پر معافی اور امن وامان کا اعلان کیا اور ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت لائی گئی۔ اس تأثر کو سب سے پہلے سرسید کے دستِ راست نواب محسن الملک نے یوں پھیلایا:

> ''انہوں نے اسباب غدر پر ایک رسالہ لکھا اور ابھی غدر فرو نہ ہونے پایا تھا کہ اس کو ہندوستان اور ولایت میں مشتہر کر دیا...... اور چونکہ سچی نیت اور سچے دل سے حسبتہً لِلّٰہ وہ رسالہ لکھا تھا، اس کا اثر بھی ہوا اور لارڈ کیننگ نے امنِ عام کی منادی کر دی۔'' [1]

اس بیان میں درجِ ذیل تین نکات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

۱۔ رسالہ شائع ہونے کے وقت ابھی غدر فرو نہیں ہوا تھا۔

۲۔ امن وامان کی منادی اس رسالے کے اثر کے باعث ہوئی۔

۳۔ یہ رسالہ اس وقت ہندوستان میں بھی شائع ہوا۔

پہلے نکتے کے متعلق ہم سرسید کے نہایت عقیدت مند رفیق خواجہ الطاف حسین حالی کی بیشتر حلقوں میں مستند تسلیم کی جانے والی ان کی تالیف ''حیاتِ جاوید'' سے صحیح کیفیت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''سرسید ابھی اپنی کتاب اسبابِ بغاوت ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن وامان کا مشتہر ہوا۔'' [2]

معلوم ہوا کہ ۱۸۵۹ء میں طبع ہونے والے رسالے کی اشاعت سے بھی پہلے مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہونے والا مبینہ ''غدر'' فرو ہو چکا تھا اور سرسید خود اس خوشی میں جولائی ۱۸۵۹ء میں دعائے شکریہ کا اہتمام کر کے اسے باقاعدہ شائع بھی کروا چکے تھے۔ اس کے علاوہ حالی کے اس بیان سے بھی کہ ''۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا''،[۳] اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ اس کے اثر سے امن و امان کی منادی ہوئی۔ یہ عجیب فلسفہ ہوا کہ جو رسالہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ میں پیش ہوا، اس کا اثر ایک سال قبل ۱۸۵۹ء ہی میں ہو گیا تھا! اس کی تردید سرسید کے اپنے بیان سے بھی ہوتی ہے جو اس رسالے کے عین آغاز کی سطورِ اول میں تحریر کرتے ہیں:

''جو اشتہار جناب ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریا دام سلطنتہا نے جاری کیا ہے، درحقیقت وہ بغاوت کے ہر ایک اصلی سبب کا پورا علاج ہے۔''[۴]

ثابت ہوا کہ حکومت کا متذکرہ اعلان رسالہ شائع ہونے سے قبل ہو چکا تھا۔ مزید برآں یہ بیان کہ یہ رسالہ ہندوستان میں بھی مشتہر کیا گیا، اس کی تصحیح کے لئے فارن سیکرٹری سسل بیڈن کے ساتھ گفتگو میں سرسید کا درج ذیل بیان اور ان کا یہ دعویٰ ہی کافی ہے:

''......جس طرح میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا، اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ (انڈیا) میں بھیجی ہے، اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔''[۵]

۱۸۵۷ء کے موضوع پر سرسید کی تالیفات میں ''سرکشی'' کا لفظ اس وقوعہ کی نوعیت کے بارے میں ان کے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ ''سرکشی ضلع بجنور'' کا موضوع چونکہ ایک خاص دائرے تک محدود تھا، اس لئے عوام میں بھی اس کا تذکرہ محدود رہا لیکن ''اسباب سرکشی ہندوستان'' چونکہ کُل ہند سطح کے بنیادی موضوعات سے متعلق تھی، اور ملک اور اس کے باشندوں کے مسائل سے تعلق رکھتی تھی، اس لئے عنوان میں سرکشی کے لفظ کی سختی کو نرم کرنے کے لئے اسے آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر ''بغاوت'' کے لفظ سے بدل کر ''اسباب بغاوتِ ہند'' بنا دیا گیا تا کہ اہالیانِ ملک میں اپنے متعلق سرکش کہلائے جانے کا جو منفی ردِ عمل پیدا ہو سکتا تھا،

اسے کم کیا جائے۔

''اسبابِ بغاوتِ ہند'' پر مزید بات کرنے سے قبل ہم اس رسالے اور ''سرکشی ضلع بجنور'' کے مندرجات میں یکساں اور اختلافی نکات کا تجزیہ دیکھتے ہیں۔ ''سرسید احمد خاں: ایک سیاسی مطالعہ'' کے مؤلف عتیق صدیقی مؤخرالذکر تصنیف کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید کے پہلے دور کی آخری تصنیف ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' ہے جو بڑی حد تک دورانِ بغاوت ہی میں مکمل ہو چکی تھی اور ''بہ فتح و فیروزی'' (بقول سرسید) بجنور میں داخل ہونے کے چند ہی ماہ بعد ۱۸۵۸ء ہی میں چھپ کر شائع ہو گئی ...... ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' کی تصنیف کے محرکات پر سرسید نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا مقصد جذبۂ تاریخ نگاری کو آسودہ کرنا ہی رہا ہو لیکن دورانِ بغاوت کی اپنی خدمات کو اجاگر کرنے کی خواہش بھی شاید ان کے تحت الشعور میں چھپی رہی ہوگی ...... اس کتاب کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ مصنف نے بغاوت کے محرکات کا تجزیہ کرنے سے ارادتاً گریز ہی نہیں کیا بلکہ بغاوت کے اسباب کو مسخ کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ...... سرسید نے بغاوت میں قولاً و فعلاً انگریزوں کا ساتھ دیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا یہ اقدام انعام و اکرام ہی کی توقع پر مبنی نہیں تھا، اس کے دوسرے بہت سے محرکات بھی تھے ...... انسان دوستی کے جذبے سے قطع نظر سرسید نے انگریزوں کا ساتھ اس لئے بھی دیا تھا کہ انہیں یقین تھا کہ یہ بغاوت ناکام ہوگی۔'' [۶]

شرافت حسین مرزا، جنہوں نے یہ کتاب اپنی اول اشاعت کے ایک صدی بعد مرتب کر کے شائع کی، اپنے مقدمے میں تحریر کرتے ہیں:

''سرکشی ضلع بجنور'' ان (سرسید) کے جس نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے وہ انگریز دوستی اور حکومت کی خیر خواہی ہے۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی ہی نہیں گئی۔ اس میں جابجا قومی رہنماؤں، آزادی کے جاں نثاروں، ضلع کے مقتدر اور بااثر

حضرات اور قابلِ احترام شخصیتوں کا ذکر سرسید نے جن الفاظ اور جس انداز سے کیا ہے، محض وہی اس کا کافی ثبوت ہے۔ مثلاً نواب محمود خاں کے لئے ہر جگہ ''نامحمود خاں'' لکھا ہے۔ پھر حرامزادہ، بدمعاش، بدذات، مفسد، نمک حرام، کم بخت جیسے الفاظ اس ضلع کے باشندوں کے نام کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ انقلابیوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے جبکہ انگریز حکام اور ان کے ساتھیوں کی تعریف کی گئی ہے اور انگریز حکام کے لئے صاحب بہادر، آقا، دامَ اقبالہم وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کا نچوڑ کتاب کا ''خاتمہ'' ہے جس میں وہ صاف صاف لفظوں میں انگریزی حکومت کی برکتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔'' ۷

شرافت حسین مرزا ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے مندرجات پر بحث کرنے کے بعد ان دونوں کتابوں کے محرکات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''سرکشی ضلع بجنور اور اسباب بغاوتِ ہند دونوں کا مرکزی اور بنیادی نقطۂ نگاہ انگریز دوستی اور انگریزی حکومت اور ملک وقوم کی خیرخواہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر میں برسرِ اقتدار کمپنی اور اس کے عہدیداروں کی، جن سے ان کا تعلق رہا، تعریفیں ہیں اور مؤخرالذکر میں (کمپنی کے) حکومت سے دستبردار ہونے کے بعد اس پر نکتہ چینی ہے۔'' ۸

وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

''ملک کی اندرونی سیاست میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان (یکم نومبر ۱۸۵۸ء) کے بعد یہ تبدیلی ہو چکی تھی کہ اب ہندوستان کمپنی کی حکومت سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آ چکا تھا اور اب کمپنی کے عہدیداروں پر نکتہ چینی کرنے اور ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کرنے میں کوئی امر مانع نہیں رہا تھا۔ خارجی سیاست یعنی برطانوی پارلیمنٹ کا یہ رنگ تھا کہ وہ بھی اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ہندوستان پر بے تکا پن [illegible] کرتی تھی۔'' ۹

اسی پس منظر کے تحت سید محمد میاں لکھتے ہیں:

''خود انگلستان کے سیاسی حالات بھی سرسید کے مساعد ہو گئے کیونکہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم کر کے ہندوستان کو براہِ راست ملکہ وکٹوریہ کے زیرِ حکومت کیا گیا تو لامحالہ ایسے الزامات کی ضرورت تھی جن سے کمپنی کی اس برطرفی کو جائز اور تقاضائے عدل و انصاف قرار دیا جا سکے۔ ''اسباب بغاوتِ ہند'' ایسے الزامات کی بہت ہی معقول دستاویز تھی جس کو ارکانِ پارلیمنٹ نے غنیمت سمجھا، چنانچہ انگریزی میں اس کا ترجمہ بکثرت تقسیم کیا گیا۔'' [10]

عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''اسباب بغاوتِ ہند کے بارے میں گزشتہ ایک صدی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے سرسید کے کارناموں میں شمار کیا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ترتیب و تالیف کے حقیقی محرکات کا تجزیہ کرنے سے ارادی اور غیر ارادی طور پر اغماض برتا گیا ہے۔ یہ حیرت ناک ہے کہ کسی کا بھی ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل نہ ہو سکا کہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے اندراجات اس نئی برطانوی حکومت کی پالیسی کے عین مطابق تھے جو اپنی پیش رو ایسٹ انڈیا کمپنی کو مطعون کرنے کے درپے تھی۔'' [11]

انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مخالفت کس نوعیت کی تھی، اس کا جائزہ لینے سے قبل اس معاشرتی نفسیات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اکثر معاملات میں ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے۔ دراصل ہر معاشرے میں مختلف نظریات رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ دنیا میں کسی ایسے معاشرے کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس کے تمام افراد ہر معاملے میں متفق الرائے ہوں۔ اگر وہ کسی خاص ملک یا معاشرے کی حکومت یا باشندوں سے متعلق متفقہ طور پر دشمنی کے جذبات رکھتے ہوں تو بھی ان میں اس امر پر اختلاف ہو سکتا ہے کہ ان سے نپٹنے کا طریق کار کیا ہو۔ حُبِ وطن کے شدید جذبات کے حامل ہونے کے باوجود جب وہ اپنے لوگوں سے دُور دوسرے ماحول میں جاتے ہیں تو اختلاف رائے کے خیالات اپنے ساتھ لے

جاتے ہیں۔ یہی کیفیت ہندوستان میں انگریزوں کی تھی۔

انگریزوں کا ایک طبقہ ہندوستان کو ہر جائز یا ناجائز طریقے سے غلام رکھنا چاہتا تھا اور ہندوستانیوں کے بارے میں سخت گیر پالیسی اختیار کرنے کا حامی تھا۔

دوسرے طبقے کا خیال تھا کہ اس ملک کو ضرور قابو میں رکھا جائے لیکن ایک خاص منصوبے پر عمل کرتے ہوئے، جس سے ہندوستانیوں کی انا کو زیادہ ٹھیس نہ پہنچے تاکہ بغاوت کا احتمال کم سے کم ہو۔ ان کا خیال تھا کہ پیار سے، محبت سے، انہیں کچھ سہولتیں، کچھ حقوق دے کر اپنا مفاد نکالا جاتا رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں بھی آپس میں سہولتوں کی نوعیت اور ان کی مقدار پر اختلاف ہوسکتا تھا۔

تیسرا طبقہ وہ تھا جو سوائے آزادی کے ہندوستانیوں کو مکمل شہری حقوق دینے کا حامی تھا۔ اس طبقے کے افراد اگر اپنے ملک میں ہوتے تو وہاں آزادیٔ رائے ہونے کے سبب ہر قسم کی رائے دینے میں خودمختار تھے مگر اس ملک میں اپنے متعدد مفادات کے تحت دبے الفاظ ہی میں بول سکتے تھے۔ قبضہ قائم رکھنے کے خواہشمندوں میں مذہبی ذہن رکھنے والے وہ انگریز بھی شامل تھے جو عیسائیت کو سچا دین سمجھتے ہوئے انسان کی اُخروی نجات کے نظریہ کے تحت اسے ہندوستان میں فروغ دینا چاہتے تھے۔

چوتھا طبقہ ہندوستان پر قبضہ قائم رکھنے کا ہی سخت مخالف تھا اور اس ملک کو آزادی دینے کی حمایت کرتا تھا مگر یہ لوگ ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

درجِ بالا مختلف خیالات رکھنے والے انگریز دونوں ملکوں میں موجود تھے مگر کمپنی کے زیادہ تر حکام طبقۂ اول اور دوم سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ محکوم قوم پر حاکمیت کا مزا چکھ کر اپنے اقتدار کو کم ہوتے نہ دیکھنے کی خواہش انسانی کمزوری ہے اور وہ لوگ اس ذائقے سے براہِ راست مستفید ہو رہے تھے اگرچہ ان میں سے بھی چند اعلیٰ عہدیدار ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جبر کرنے والوں سے اختلاف کا اظہار کرتے رہے۔ ہندوستان کے متعلق مختلف آرا ظاہر کرنے والے بعض انگریزوں کی تحریروں اور تقریروں سے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں

جوسطورِ بالا میں بیان کردہ کیفیت کی تائید کرتے ہیں۔

ایک انگریز جیمز برائن نے اپنے مضمون ''بغاوتِ ہند اور برطانوی رائے'' میں اپنی قوم کی صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ برطانیہ کے مزدوروں اور شہری متوسط طبقے کے تاثرات میں تین اختلافات کو یوں بیان کرتا ہے:

''اختلافی مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان سے متعلق برطانوی پالیسی میں عیسائیت کا کیا پارٹ ہو۔ کیا ہندوستانیوں کو ''واحد دینِ برحق'' قبول کرنے پر مائل کیا جائے یا انہیں ''کافرانہ بُت پرستی اور توہمات'' میں مبتلا رہنے دیا جائے؟ دوسرا اختلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان تھا۔ تیسرے اختلاف میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہندوستان کو برطانوی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کو ایک غلط قدم سمجھتے تھے، دوسری طرف وہ لوگ جو اِس جرأت مندانہ اقدام کو برطانوی تاریخ میں ایک سنہرا ورق تصور کرتے تھے اور ہندوستان کو برطانیہ کے شہنشاہی تاج کا سب سے زیادہ تابناک ہیرا بنانا چاہتے تھے۔'' [۱۲]

مضمون نگار نے اس موضوع پر برطانیہ کی بعض شخصیات اور اخبارات و جرائد کی چند آرا کے درجِ ذیل نمونے پیش کئے ہیں:

''کابڈن نے لکھا: ہم سب جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایشیا جانے کا کیا مقصد تھا۔ یہ مقصد اجارہ داری تھا۔ یہ اجارہ داری نہ صرف غیر ملکیوں کے خلاف بلکہ اپنے باقی ہم وطنوں کے خلاف بھی تھی۔'' اس کا خیال تھا کہ کمپنی کو برقرار رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ''کمپنی نے اپنے آپ کو ایسے جرائم کے ارتکاب کا اہل ثابت کیا ہے جو کسی...... وحشی قبیلے سے بھی نہ سرزد ہوتے...... دی ویکلی ڈسپیچ نے، جس کا مقصد اخبار پڑھنے والے مزدور طبقے کی توجہ سماجی اور معاشی نظام کے خلاف بغاوت کی طرف سے ہٹانا تھا، یہ رائے ظاہر کی کہ ''اگر ہم ہندوؤں اور مسلمانوں سے ان کے جرائم کا انتقام لیں اور فرنگی حکام کو چھوڑ دیں جن کی بداعمالی ان جرائم کا موجب ہوئی تو یہ نامردی اور بے دینی ہوگی''...... دی

ڈیلی ٹیلیگراف نے کمپنی کی اس بنا پر مذمت کی کہ حکومت کی باگ ڈور ایک ''واحد طبقے'' کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے...... دی نان کنفارمسٹ نے بھی کمپنی پر حملہ کیا۔ لارڈ پامرسٹن، جو ہندوستان کے معاملات پر اظہارِ رائے میں بے ساختہ اور بے لاگ تھا، جھٹ اس نتیجے پر پہنچا کہ کمپنی کو بند کر دینا چاہیے۔'' [۱۳]

''اس بات کا ثبوت کہ لارڈ شیفٹس بری نے انتقام کے حق میں اپنی رائے برقرار رکھی، ایک خط سے ملتا ہے جسے اُس نے مارٹن ٹپر کو لکھا۔ یہ بکنگھم محل میں ایک ہر دلعزیز شاعر تھا۔ ان نظموں کے علاوہ، جس میں اس نے دہلی کی مکمل تباہی اور مجرموں کے لئے قطار در قطار پھانسی کے تختے نصب کرنے کا تقاضا کیا، اس نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ بننا چاہیے۔'' [۱۴]

''ارنسٹ جونز ...... نے ایک طویل نظم بعنوان ''ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت'' لکھی تھی...... اس کے دیباچے میں جونز نے شہنشاہی نعرے میں مشہور ترمیم کی۔ شہنشاہی نعرہ یہ تھا: ''برطانوی سلطنت پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا''۔ اس نے اس میں یہ تبدیلی کی: ''اس کی نوآبادیوں پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔'' [۱۵]

جونز نے لکھا: ''...... ایک بات کا ہمیں یقین ہے۔ خواہ بغاوت دب جائے یا نہ دبے، یہ ہمارے ہاتھ سے ہندوستان کے نکلنے کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے: ہندوستانی قوم کی آزادی کو تسلیم کرو۔ سو سال ہوئے، دنیا کی پھیری لگانے والے لیڈن ہال سٹریٹ کے تاجر لٹیروں کی ایک جماعت حیلے بہانے بنا کر چپکے سے سلطنتوں کے اس عظیم جمگھٹ میں وارد ہوئی اور اس کا ہیرا (یعنی آزادی) چرا لیا۔ اس سو سالہ عہد میں جرائم کے ہزاروں سال سمٹے ہوئے ہیں ...... اس نے ہندوستان کی بدنظمی کا تمام تر الزام ایسٹ انڈیا کمپنی پر رکھنے کے منصوبے سے آگاہ کیا: ''کمپنی کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ہوم گورنمنٹ (برطانوی حکومت) قائم کرنا گویا ایک لٹیرے کو ہٹا کر دوسرا لٹیرا مسلط کرنا ہے۔'' [۱۶]

جونز...... نے کہا: ''ایک لمحہ کے لئے بھی آپ یہ سمجھیں کہ میں اس طریق کو تسلیم کرتا ہوں جس سے ہندوستان کی حکومت حاصل کی گئی یا ان ہتھکنڈوں کو جن سے اسے قائم رکھا گیا، میں اسے ایک مہذب ملک کی تاریخ میں شروع سے آخر تک ایک قبیح ترین جرم تصور کرتا ہوں۔'' [۱۷]

سید طفیل احمد منگلوری تحریر کرتے ہیں:

''جان برائٹ ...... نے ۱۸۵۳ء میں ہندوستان کے نظامِ سلطنت کو ناقص قرار دے کر اس میں تبدیلی کرنے پر زور دیا...... موصوف نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

''ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی حلیم قوم کبھی نہ تھی۔ تمہیں خدا نے فرانس سے دس گنا وسیع ملک دیا ہے جو تمہاری شان وشوکت کی حرص وآرزو کی اشتہا کو بجھانے کے لئے کافی ہے، اس لئے ملک گیری بند کرو اور عقلمندی کے ساتھ اس ملک پر حکومت کرو جس سے رفتہ رفتہ اختلافِ قومیت رفع ہو جائے تاکہ وہ ہمیں بجائے فاتح کے اپنا محسن سمجھیں۔ اگر تمہیں ان کا عیسائی ہونا پسند ہے تو بھی بجائے دوسرے طریقوں کے، عیسائیت کے اعلیٰ اخلاق اختیار کر کے ان کے سامنے عمدہ نمونہ بنو۔'' (اہلِ ہند کا ارتقا، از اے. سی. مزمدار، ص ۱۰) ...... جان برائٹ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۸۰ء تک مسلسل ۳۳ سال پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور برابر ہندوستان کی حمایت کرتے رہے، اور لطف یہ کہ ہندوستان کے عہدۂ وائسرائے کے قبول کرنے میں ۱۸۶۸ء میں انکار کر دیا۔'' [۱۸]

برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر ڈرمنڈ نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

''...... ہمارا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ ایسا خراب ہے تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ مجھے مسٹر فرنیر سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ناراضی کا اتنا مواد موجود ہے کہ اس سے نصف درجن بغاوتیں ہو جائیں۔ اصل وجہ ناراضی کی یہ ہے کہ ہندوستان کو سول سروس کے نفع

کے لئے چوسا جاتا ہے۔ پس اگر ہم اب بھی ہندوستان کو انگریز عہدیداروں کی لُوٹ کا مقام سمجھتے ہیں تو ہم نہ صرف اسے کھو بیٹھیں گے بلکہ اسی کے مستحق ہیں کہ اسے کھو دیں۔'' [۱۹]

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کمپنی کی حکومت کے بارے میں ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی کیا آراتھیں۔ سید طفیل احمد منگلوری اپنی تالیف میں تحریر کرتے ہیں:

''ہندوستان کی سول سروس میں اور اعلیٰ عہدیداروں میں بہت سے انگریز ایسے تھے جو ہندوستان کی حمایت میں حکامِ بالادست سے لڑتے رہتے تھے، اور اس پر سماعت نہ ہوتی تھی تو اپنے جلیل القدر مناصب سے مستعفی ہوکر چلے جاتے تھے، چنانچہ لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی کو ہندوستان کی مصنوعات کی حمایت میں گورنری کا عہدہ چھوڑ دینا پڑا...... لارڈ لٹن آئے تو وہ بھی ہندوستانیوں کو انگریزوں کے برابر عہدے نہ ملنے پر سخت ناراضی کا اظہار کرتے رہے...... لارڈ رپن نے ایک اور زبردست کام یہ چھیڑا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے ''البرٹ بل'' پیش کرایا تھا جس کی غرض یہ تھی کہ یورپین اور امریکن مجرموں کے مقدمات ہندوستانی مجسٹریٹ کرسکیں تاکہ ہندوستانیوں پر سے اس ذلت کا دھبہ دور ہو۔ اس پر اینگلو انڈین اصحاب نے زبردست شورش کی، جن کے شریک ایک صوبہ کے لفٹنٹ گورنر اور دیگر حکام تھے۔ ان اصحاب نے اس کام کے لئے ''اینگلو انڈین ڈیفنس ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک جماعت بنائی اور اس کے ذریعے ہندوستانیوں پر سخت حملے کئے۔ چونکہ ہندوستانیوں کی اس وقت کوئی سیاسی جماعت نہ تھی، اس لئے اینگلو انڈین اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور فریقین کے سمجھوتہ سے قانون مذکور کو ڈسٹرکٹ جج اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالتوں تک محدود کر کے پاس کر دیا گیا...... اینگلو انڈین اصحاب نے ان (لارڈ رپن) کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جس کی وجہ سے انہیں اپنی مدتِ ملازمت ختم ہونے سے ایک سال قبل ولایت کو واپس جانا پڑا۔'' [۲۰]

معلوم ہوا کہ ہندوستان پر حکمرانی کے طریقۂ کار سے متعلق دونوں ملکوں میں انگریزوں میں مختلف آرا رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاجِ برطانیہ کو منتقلی کے مسئلہ میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی جدید تحقیق کی روشنی میں سرسید کے مثبت اور منفی نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید کے بارے میں ہمارے ہاں پہلی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر بڑی جرأت و ہمت کا ثبوت دیا، لیکن واقعات کا تجزیہ ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار رہا جبکہ انگلستان میں پارلیمنٹ کمپنی کے اقتدار کو پسند نہیں کرتی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح کمپنی کے اقتدار کو ختم کر کے براہِ راست پارلیمنٹ کے اقتدار کو ہندوستان میں قائم کرے۔ اس سلسلہ میں پارلیمنٹ نے مختلف اوقات میں اپنے اثر کو بڑھانے کے لئے مختلف طریقوں سے کمپنی کے معاملات میں دخل دیا۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا تو پارلیمنٹ کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت ناکام ہو چکی ہے، اس لئے ہندوستان سے کمپنی کی حکومت ختم کر کے ملک کو براہِ راست پارلیمنٹ اور ملکہ برطانیہ کے تحت میں لایا جائے۔ اس موقع پر سرسید کا رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' پارلیمنٹ کے لئے ایک بہترین دستاویزی ثبوت ثابت ہوا جس میں کمپنی کی پالیسیوں پر تنقید کی گئی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا ذمہ دار انہی کو قرار دیا گیا تھا، اس لئے یہ رسالہ ممبرانِ پارلیمنٹ کے لئے، جو کمپنی کے خلاف تھے، ایک نعمت سے کم نہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے کمپنی کی حکومت کے خلاف دلائل دئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے کمپنی کا اقتدار ختم ہوا اور یہاں پر پارلیمنٹ اور تاجِ برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ اس پس منظر میں اس بات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ رسالہ سرسید سے لکھوایا گیا ہو۔'' [۲۱]

اور ایسا ہونا غیر ممکن بھی نہیں کیونکہ بعض کیفیات اس امر کی غمازی کرتی ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ۲۸ دسمبر ۱۸۹۴ء کو سرسید نے اپنے ایک خطاب میں بڑے وثوق کے ساتھ سوالیہ انداز میں یہ بیان کیا تھا:

''کیا آپ ہم کو کوئی ایسا مسلمان بتا سکتے ہیں جس میں ایسی لیاقت ہو کہ اگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی انگریزی اخبار جاری ہو تو اس لیاقت سے ایڈیٹری کر سکے کہ اس کے لکھے ہوئے مضامین کو، اس کی عبارت کو، اس کے طرزِ تحریر کو انگریز پسند کریں اور اُن پر اثر ڈالے اور انگریزوں کو اس کے پڑھنے کا شوق ہو اور مسلمانوں کے مقاصد اس سے پورے ہو سکیں؟'' [۲۲]

یہ وہ وقت تھا جب سرسید کے جاری کردہ علی گڑھ کالج کو قائم ہوئے دو دہائیاں گزر چکی تھیں اور مسلمانوں میں ان کی تعلیمی جدوجہد کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ اس سے پینتیس سال قبل اس ضمن میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی انگریزی میں کاملیت کی کیا کیفیت ہوگی، اور اگر نواب محسن الملک کا یہ بیان درست ہے کہ رسالہ اسبابِ غدر لکھتے وقت سرسید ''نہ انگریزی جانتے تھے اور نہ انگریزوں سے اختلاط رکھتے تھے''، [۲۳] تو وہ کون مسلمان تھا جس نے رسالہ کی تکمیل میں ان کے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہوئے اس کا نام، دیباچہ اور متن کے تمام عنوانات ایسی بہترین انگریزی میں ترجمہ کیے جیسے کہ یہ اس کی مادری زبان ہو، اور جسے بائیبل پر اس قدر عبور تھا کہ اس نے اس کے انگریزی متن سے مناسبِ حال عبارتیں رسالہ کے سرِ ورق کے لئے تجویز کیں؟ دراصل یہ رسالہ اردو میں لکھوانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اسے فقط ایک ہندوستانی مسلمان کی رائے ظاہر کرنا مقصود تھا۔ دیباچہ اور عنوانات کے انگریزی تراجم شامل کرنے میں یہ مصلحت کارفرما ہو سکتی ہے کہ ان کو ایک نظر دیکھنے سے برطانوی پارلیمنٹ کے کمپنی مخالف ارکان کو اس مضمون کے متن کی اہمیت کا اندازہ ہو کر اس کے مطالعہ کی رغبت ہو اور وہ دیگر ارکان کو ہندوستان سے متعلق مستقبل کی حکمتِ عملی میں ہمنوا بنانے کے لئے اس کے انگریزی تراجم کا اہتمام کریں۔ بعد کے واقعات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ بقولِ حالی ''اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے، انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس پر

متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں، پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا''۔ [۲۴]

یہ راز سرسید کی ذات اور اس منصوبے میں شامل ان کے انگریز مہربانوں ہی کو معلوم ہے جو کمپنی مخالف نظریات کے حامل تھے مگر بوجوہ خاموش تھے اور پارلیمنٹ کمپنی کشمکش میں اپنی شناخت کو مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ ان انگریزوں کو ایک معروف ہندوستانی اہلِ قلم کی ضرورت تھی جس کو سہارا بنا کر وہ ہندوستانی نقطۂ نظر کی آڑ میں اپنی بات کہہ سکیں۔ ''سرکشی ضلع بجنور'' میں انہوں نے سرسید کے قلم کی اثر پذیری دیکھ کر محسوس کیا ہوگا کہ اسبابِ بغاوت ان سے لکھوائی جاسکتی ہے کیونکہ وہ اس موضوع کی مناسبت سے ماہرانہ انداز میں رسالہ تالیف کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس رسالہ میں ان کی تالیفی قوت کو پہلی کتاب کے برعکس ''کمپنی بہادر'' کی تعریف کی بجائے اس کی مخالفت اور وقت کی حکومت کی تعریف میں منتقل کروایا گیا۔ سرسید میں یہ اہلیت موجود تھی کہ وہ اپنی ہی لکھی ہوئی تحریروں کے ردّ میں بڑے وزنی دلائل دے سکتے تھے۔ حکیم محمود احمد برکاتی کا یہ مختصر سا تبصرہ ان کے متذکرہ وصف کی بہترین ترجمانی کرتا ہے:

> ''وہ اپنی رائے کو حتمی طور پر ظاہر کیا کرتے تھے، ان کا ہر قیاس عقیدہ بن جاتا تھا، ان کی ہر بات میں قطعیت ہوتی تھی...... چاہے پھر اس حتمی رائے اور عقیدہ کی تردید ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اور لطف یہ ہے کہ تردید بھی اسی شانِ قطعیت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔'' [۲۵]

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ عام کتابیں فروخت کے لئے شائع کی جاتی ہیں جس سے ان پر اُٹھنے والے اخراجات وصول ہو جاتے ہیں۔ یہ رسالہ صرف اور صرف حکامِ بالا کے مطالعہ کے لئے لکھا گیا تھا، اس لئے صرف انہیں بھیجا گیا۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان رسالوں کی اشاعت اور ان کی لندن ترسیل وغیرہ کے لئے سرمایہ کس نے مہیا کیا؟ اس کے علاوہ جب انہوں نے بقولِ خود کچھ کم پانچ سو رسالوں کا بنڈل لندن بھیجا تو وہ کس کے نام گیا؟ اتنی تعداد میں کتابیں آخر کار فرداً فرداً تقسیم کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ تمام کتابوں کو سادہ طور پر ایک بنڈل کی صورت دی گئی تو لندن میں انہیں متعلقین تک کس نے پہنچایا؟ اگر وہاں پر مقیم

کسی ہندوستانی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تو کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں اس کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ اس کام سے عہدہ برآ ہونے والے کی بڑی اہمیت ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اگر اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ ہر کتاب کو الگ الگ پیک کر کے محکمہ ڈاک کی آسانی کے لئے ایک بنڈل بنا کر ان کے حوالے کیا گیا تا کہ وہ اسے منزلِ مقصود پر کھول کر تقسیم کریں تو سرسید کو اتنے زیادہ ایڈریس کس اہلِ وطن نے مہیا کئے؟ ڈیڑھ سو سال قبل غیر ملکیوں کے لئے حکمرانوں کے دیس کی ایسی معمولی معلومات بھی آسانی کے ساتھ دستیاب ہونا ممکن نہ تھا لہٰذا یہ کام وہاں کے باشندوں کے تعاون کے ساتھ ہی پایۂ تکیل کو پہنچ سکتا تھا۔ مزید برآں اس تمام نقل وحمل کا بار کس نے اٹھایا؟ سرسید نے ان جملہ اخراجات کے بارے میں کبھی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ان کے عقیدت مندوں میں سے کسی نے اس پر کبھی کوئی روشنی ڈالی ہے حالانکہ متعدد کتب ورسائل میں ''خطباتِ احمدیہ'' کی اشاعت کے بارے میں اخراجات کا آج تک بڑا چرچا ہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت اعلیٰ سطح کی ہدایات کے تحت کیا گیا اور رسالہ کے لکھوانے والے ہی اس سلسلے میں تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے؟

''اسباب بغاوتِ ہند'' کی اشاعت پر سرسید کی ہمت وجرأت کے ضمن میں بڑے افسانے تراشے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عارف الاسلام بیان کرتے ہیں کہ اس تصنیف کی اشاعت پر ''برطانیہ کی پارلیمنٹ میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرسید کو سخت سزا دی جائے''۔ [۲۶] مولوی عبدالحق نے فرمایا کہ ''تمام انگریز بے حد برہم ہوئے اور انہیں باغی اور قابلِ دار سمجھا گیا''۔ [۲۷] پروفیسر محمد اسلم نے ان الفاظ میں نئی تاریخ بنانے کی کوشش کی:

> ''سرسید نے اسبابِ بغاوت کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اسے برطانوی دارالعوام کے ایک ایک رکن تک پہنچایا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس جنگ میں انگریزوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا مسلمانوں کا۔ اس پر لارڈ لٹن نے بیان دیا تھا کہ سرسید کو پھانسی دے دی جائے۔'' [۲۸]

نہ سرسید نے اسبابِ بغاوت کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور نہ اس کے متن میں وہ کچھ ہے جو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ لارڈ لٹن کی جانب سے پھانسی ''دے دی جائے'' کا فرمان بھی ان کی ذہنی

اختراع ہے۔ لارڈلٹن اس رسالے کی اشاعت کے سترہ برس بعد ۱۸۷۶ء میں وائسرائے ہوئے۔ علاوہ ازیں سرسید جیسی شخصیت کولارڈ صاحب کے بیان پر ہی پھانسی دے دینے کا حکم بڑی حیرتناک بات ہے۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب تو اُن سے بھی بازی لے گئے اور سرسید کو پھانسی کا حکم صادر فرمادیا۔ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے لکھنے پرانہیں پھانسی کی سزاسنائی گئی لیکن چونکہ یہ کتاب حقائق پر مبنی تھی، اس لئے انگلستان کے بعض انسان دوست انگریزوں نے کوشش کر کے ان کی سزامعاف کرادی۔'' [۲۹]

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کوکسی نے انگلی بھی لگانے کی جرأت نہیں کی۔ حالی نے ان کی سوانح میں کہیں یہ لکھ دیا کہ جب سرسید نے اسباب بغاوتِ ہند کی جلدیں ''پارلیمنٹ اور گورنمنٹ میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس، جو اس وقت مرادآباد میں منصف اور سرسید کے دوست تھے، انہوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلادو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو''۔ [۳۰] ہمارے اہلِ قلم اپنی تحریروں میں اس واقعے کو بار بار ایسے بیان کرتے ہیں جیسے رائے شنکر داس دنیا کا کوئی مدبّر ترین انسان تھا اور اس کی رائے الہامی تھی حالانکہ ان کتابوں کی ترسیل کے بعد سرسید پر کسی قسم کی کوئی آفت نہ آئی اور اس کے خدشات سوفیصد غلط ثابت ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ ایک انگریز حاکم سسل بیڈن فارن سیکرٹری کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ اس نے بقولِ حالی ''اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسبِ ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے، اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزادینی چاہیے''۔ حالی کی تحریر سے سیاق وسباق کے بغیر واوین میں دیا گیا اقتباس پیش کر کے اصل صورتِ حال کومسخ کر دیا جاتا ہے جبکہ سیاق وسباق کے ساتھ حالی کی عبارت سے درست کیفیت یوں واضح ہوتی ہے:

''گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہوکر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریئر نے، جو کونسل میں ممبر تھے،

اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا مگر مسٹر سسل بیڈن نے، جو اس وقت فارن سیکرٹری تھے، اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسبِ ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے، اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔ لیکن چونکہ اَور کوئی ممبر اُن کا ہم رائے نہ تھا، اس لئے ان کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔'' [۳۱]

غور طلب امر یہ ہے کہ جب پوری کونسل میں اَور کوئی ممبر سسل بیڈن سے متفق نہ تھا اور ملک کا گورنر جنرل تک سرسید کے مضمون کو خیر خواہی پر محمول کرتا تھا تو کون شخص ان کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتا تھا؟ کیا اتنی بڑی شخصیتوں کی یہ رائے سرسید کے دفاع میں ایک مضبوط ڈھال نہیں تھی؟ سسل بیڈن کے علاوہ کسی اور انگریز حاکم کے اس طرح کے شدتِ جذبات کے اظہار کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اگر اس نے سرسید کے متعلق سخت زبان استعمال کی تو بادی النظر میں اس کی درجِ ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں:

۱۔ وہ گورنمنٹ کے اندر اس گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو ''کمپنی بہادر'' کی حمایت کرتا رہا ہو اور اس کتاب کے متن سے اس کے خیالات کا ردّ ہوتا ہو۔

۲۔ بعض بیوروکریٹ مزاج کے مالک عہدیدار قانونی موشگافیوں کے بہت عادی ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ سسل بیڈن نے اس خیال کے تحت متذکرہ رائے دی ہو کہ سرسید کے اس اقدام سے اس قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوا جس کی رُو سے سرکاری ملازمین کو سیاسی مسائل پر بولنے کا قطعاً اختیار نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ سرسید سرکاری ملازم تھے اور وہ اس قانون کے تحت ایک بہت بڑے سیاسی موضوع پر اتنی ''زبردست'' باتیں کہنے کے مجاز نہیں تھے۔

۳۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیڈن کو اس اشاعت کے اصل پس منظر سے آگاہی نہ ہو کیونکہ اس وقت دو مختصر فریقوں کے علاوہ اندر خانے کے اسرار کی کوئی بھی خبر نہ رکھتا تھا۔

۴۔ وہ انگریزوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہو جو ہندوستانیوں کے بارے میں سخت گیر پالیسی اختیار کرنے کے حامی تھا۔

ممکن ہے کہ سسل بیڈن متذکرہ بالا تمام نکات کا حامل ہو لیکن اگر اس کے عمومی خیالات کو مدِ نظر رکھا جائے تو مؤخر الذکر نکتہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ سسل بیڈن وہ شخص ہے جس نے سقوطِ دہلی کے بعد انگریز حکام کے بہادر شاہ ظفر کے ساتھ کئے گئے جاں بخشی کے وعدے پر سخت تنقید کی۔ ولیم میور کے نام ۱۳/ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو لکھا گیا مراسلہ اس کے مزاج پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔ اس نے لکھا:

''میں اسے نہایت بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ شاہِ دہلی کے ساتھ شرائط طے کی گئیں۔ وہ سرسری سزا کا مستحق تھا، بالکل ایسے ہی جیسے اس کے بیٹوں اور پوتے کو درست طور پر دی گئی (یعنی گرفتاری کے فوراً بعد شہزادے دہلی لائے گئے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر کیپٹن ہڈسن نے ایک عظیم مجمع کے سامنے انہیں کسی قسم کی کارروائی کے بغیر گولی سے اُڑا دیا۔ [مرتب])...... میں ایک لمحے کے لئے بھی اس امر پر شک کا اظہار نہیں کر سکتا کہ یہ شخص باغیوں کا نہایت چھٹا ہوا سرغنہ ہے اور مکمل طور پر موت کی سزا کا مستحق ہے، اور میں یقینی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اسے محل کی دیوار پر پھانسی دینا ہندوستان بھر میں بھرپور طور پر مؤثر ہوتا۔'' ۳۲

ایسے شخص نے اگر اپنی عادت سے مجبور ہو کر سرسید کو سزا دینے کی بات کر دی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ اس کی خواہش کے تحت بہادر شاہ ظفر کو سزائے موت ہوئی اور نہ سرسید کو کوئی گزند پہنچی اور وہ وقت بھی آن پہنچا جب یہی سسل بیڈن بعد میں بقولِ حالی ''ہمیشہ سرسید کے دوست اور مددگار رہے''۔ ۳۳

متذکرہ بالا بحث سے قطع نظر حالات و واقعات کا نفسیاتی طور پر بھی جائزہ لیا جائے تو ہمیں یقین کرنا پڑے گا کہ سرسید کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے وہ انگریز اور ان کے ہم وطن حکمران مکمل طور پر ان کی پشت پر تھے جن کو انہوں نے بجنور کے قیام کے دوران اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر بچایا تھا کیونکہ بقول خود سرسید ان کے اس فعل کا محرک محض انسانیت کے ناطے انگریز افراد کی جانیں بچانا نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے انگریزی حکومت کو تحفظ بخشنے کا جذبہ

پوری طرح کارفرما تھا۔ انگریزوں کے لئے سرسید کے جذباتِ محبت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان کی حمایت کے جرم میں انہیں قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید آگے چلتے جاتے تھے اور موت ان کا تعاقب کرتی جاتی تھی مگر ہر بار ایسے اتفاقات ہوئے کہ وہ حریت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ بچ گئے۔ انہی کے الفاظ میں ایسے لمحات کی داستان کے چیدہ چیدہ مختصر اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

''جب غدر ہوا، میں بجنور میں صدر امین تھا کہ دفعتاً سرکشی میرٹھ کی خبر بجنور میں پہنچی ...... اسی وقت سے میں نے اپنی گورنمنٹ کی خیرخواہی اور سرکار کی وفاداری پر چست کمر باندھی۔ ہر حال اور ہر امر میں مسٹر الیگزنڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور کے شریک رہا، یہاں تک کہ ہم نے اپنے مکان پر رہنا موقوف کر دیا۔ دن رات صاحب کی کوٹھی پر حاضر رہتا تھا اور رات کو کوٹھی کا پہرہ دینا اور حکام کی اور میم صاحبہ اور بچوں کی حفاظت جان کا خاص اپنے ذمہ اہتمام لیا۔ ہم کو یاد نہیں ہے کہ دن رات میں کسی وقت ہمارے بدن پر سے ہتھیار اترا ہو۔'' ۳۴

''(میم صاحبہ کو سرسید کی تشفی) جب تک ہم زندہ ہیں، آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے، اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔'' ۳۵

''ہم اپنے دل کا حال بیان کرتے ہیں کہ جناب مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر دام اقبالہ اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر دام اقبالہ...... صاحبوں کی خدمت گزاری میں ہم اپنی جان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ بے مبالغہ میں اپنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہوں کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا، وہ بُرا ہی بُرا دکھائی دیتا تھا اور جب اس وہم کا اثر دل پر پہنچتا تھا تو دل سے ایک محبت کا بہت بڑا شعلہ نکلتا تھا اور وہ ان صاحبوں کو گھیر لیتا تھا اور ہمارا دلی ارادہ یہ تھا کہ خدانخواستہ اگر بُرا وقت آئے تو اول ہم

پروانہ کی طرح قربان ہو جائیں، پھر جو کچھ ہو سو ہو۔'' ۳۶

''جب دفعتاً ۲۹ نمبر کی کمپنی سہارن پور سے بجنور میں آ گئی، میں اس وقت صاحب ممدوح کے پاس نہ تھا۔ دفعتاً میں نے سنا کہ فوج باغی آ گئی اور صاحب کے بنگلہ پر چڑھ گئی۔ میں نے یقین جان لیا کہ سب صاحبوں کا کام تمام ہو گیا مگر میں نے نہایت بُری بات سمجھی کہ میں اس حادثہ سے الگ رہوں۔ میں ہتھیار سنبھال کر روانہ ہوا اور میرے ساتھ جو ایک لڑکا صغیر سن تھا، میں نے اپنے آدمی کو وصیت کی، میں تو مرنے جاتا ہوں مگر جب تُو میرے مرنے کی خبر سن لے تب اس لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجو۔ مگر ہماری خوش نصیبی اور نیک نیتی کا یہ پھل ہوا کہ اس آفت سے ہم بھی اور ہمارے حکام بھی سب محفوظ رہے مگر مجھ کو ان کے ساتھ اپنی جان دینے میں کچھ دریغ نہ تھا۔'' ۳۷

''ہم کو کچھ امید نہ تھی کہ آج کی رات خیر سے گزرے گی اور بڑا اندیشہ ہم کو حکام انگریزی اور جناب میم صاحبہ کا تھا کیونکہ یہ نمک حرام کمبخت تلنگے خاص حکام انگریزی کو نقصان پہنچانے کے در پے تھے...... ہم جب اس رات کوٹھی پر آن کر بیٹھے ہیں تو اس ارادے سے نہیں آئے تھے کہ ہم زندہ یہاں سے پھر اپنے گھر آئیں گے۔'' ۳۸

''منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں، اس لئے ان کا قتل واجب ہے۔ اور درحقیقت ہماری خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی۔'' ۳۹

''جبکہ بجنور میں لڑائی ہوئی تو ڈپٹی کلکٹر صاحب ہلدور میں تھے اور ہماری کمیٹی کے تینوں ممبر...... بجنور میں اپنے اپنے مکان بند کئے بیٹھے تھے اور جو

صدمہ ہمارے دل پر تھا، اس کا بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے خیال میں بھی نواب کی شکست ہونی نہیں آتی تھی اور خوب ہم کو یقین تھا کہ نواب ہم تینوں کی جان نہیں بخشنے کا، کیونکہ سچا جرم طرفداری اور خیر خواہی سرکار اور خفیہ خط و کتابت کا، جو اس نے ہمارے طرف لگا رکھا تھا، اس کے سوا یہ بڑا شبہ اس کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ چودھریوں کا لڑنا، علی الخصوص چودھریانِ بجنور کا بمقابلہ پیش آنا، یہ ہم لوگوں کے اغوا سے ہوا حالانکہ ہم اس اخیر الزام سے بالکل بری اور بے خبر تھے۔'' [۱۴۰]

''مجھ صدرامین اور ڈپٹی صاحب نے مکان تحصیل کو بند کر کے اور پانچ سات آدمی، جو ہمارے ساتھ تھے، ان کو لے کر اور ہتھیار بندوق سے آراستہ ہو کر اس دھیان میں ہو بیٹھے کہ اب احمد اللہ خاں بجنور میں آتا ہے، جہاں تک ممکن ہوگا، ہم اس سے لڑیں گے، آخرکار مارے جائیں گے۔ اور جس قدر خطوط اور کاغذات از طرف حکام انگریزی در بابِ انتظامِ ضلع ہمارے پاس آئے تھے اور جتنی رپورٹیں کہ ہم نے یہاں سے روانہ کی تھیں اور ان کی نقلیں ہمارے پاس موجود تھیں، ان سب کو ہم نے بنظرِ دوراندیشی جلا دیا ...... رات کے وقت چودھری رندھیر سنگھ نے ہم سے کہا کہ میرا ارادہ یہاں کے قیام کا نہیں ہے اور چودھریانِ بجنور بھی جانے والے ہیں، تمہارا رہنا یہاں مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم بھی آج ہی رات کو ہلدور چلے جاؤ۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب اور میں صدرامین اخیر رات کو بجنور سے روانہ ہوئے اور صبح ہوتے ...... ہلدور میں پہنچے۔'' [۱۴۱]

''...... ہندوؤں کو مسلمانوں سے اس قدر عداوت ہوگئی کہ چند آدمی، جو اتفاقیہ ہلدور میں وارد تھے، وہ بھی مارے گئے۔ گنوار بخوبی پکار پکار کر ہم لوگوں اور ڈپٹی صاحب (رحمت خان) کی نسبت صاف صاف کہتے تھے کہ گو یہ لوگ چودھریوں سے ملے ہوئے ہیں مگر مسلمان ہیں، ان کو بھی مار ڈالنا چاہیے مگر

چودھری رندھیر سنگھ نے ہماری بہت حفاظت کی...... جب یہ حال ہوا تو پھر ہم نے اپنا قیام ہلدور میں بھی مناسب نہ جانا...... گیارہ بجے رات کے ہم پیادہ پا وہاں سے نکلے اور نہایت مشکل اور تباہی سے راستہ کاٹا۔ صبح ہوتے ہم لوگ...... قریب موضع پجنیاں کے پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ پجنیاں میں بہت سے لوگ ہمارے لُوٹنے اور مارنے کو جمع ہیں، اس لئے اس راہ کا چھوڑنا ضرور پڑا اور پلانہ کا راستہ اختیار کیا۔ جب موضع پلانہ کی سرحد میں پہنچے، دفعتاً دو ہزار گنوار مسلح ہم پر دوڑے اور ہمارے لُوٹنے اور قتل کا ارادہ کیا۔ مسمی بخشی سنگھ پدھان موضع پلانہ نے مجھ کو اور ڈپٹی صاحب کو پہچانا اور ان گنواروں کو روکا ...... جب ہم قریب دروازہ چاند پور کے پہنچے اور بدمعاشان مسلمانانِ چاند پور کو ہمارے آنے کی خبر ہوئی، دفعۃً محلہ بتیا پارہ میں ڈھول ہوا اور صدہا آدمی تلوار اور گنڈاسہ اور طمنچہ اور بندوق لے کر ہم پر چڑھ آئے ...... ہمارے مارے جانے میں کچھ شبہ باقی نہ تھا مگر فی الفور میر صادق علی رئیس چاند پور ہماری مدد کو پہنچے اور اپنے رشتہ داروں اور ملازمان کو ساتھ لے کر ان مفسدوں کو روکا۔ اس عرصہ میں اَور بہت سے آدمی شہر کے ہماری اعانت کو آئے اور اُن بدذاتوں کے ہاتھ سے ہم کو بچایا...... چاند پور میں جو ہم پر آفت پڑی، گو اصلی منشا اس کا یہی تھا کہ ہم سرکار کے خیر خواہ اور طرفدار تھے اور اعلانیہ سرکار کی طرفداری کر کے انتظام ضلع کا اٹھا لیا تھا لیکن اس قدر عام بلوے کے ہمارے پر ہونے کا یہ سبب تھا اور سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ (ہندو) چودھریوں سے سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو مروا دیا اور لوگوں کی جورو بیٹی کی بے عزتی کروائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا، اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے۔" ۴۲

۱۸۵۷ء کے دوران انگریزوں کے حق میں سرسید کی جدوجہد اس قسم کی جاں فشانیوں اور وفاداریوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کی بنیاد پر حکام کی جانب سے انہیں ان کی

وفاداری اور خیر خواہی کی زبانی اور تحریری اسناد عطا ہو چکی تھیں اور بقولِ خود سر سید وہ با قاعدہ ''بحکم گورنر جنرل بہادر'' صدر امین سے صدر الصدور کے عہدے پر ترقی، دونسلوں تک دو سو روپے ماہوار پنشن اور دیگر انعامات سے نوازے جا چکے تھے۔[۴۳] اپنی وفاداری کی سب سے بڑی زبانی سند کو سرسید نے بڑے فخر سے یوں بیان کیا ہے:

''میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں۔ اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چال چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے، جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے، سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری

اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے۔'' [۴۴]

صاحبِ نظر افراد ان تمام واقعات اور اسناد کی روشنی میں خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ انگریز انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے تھے، مگر حقائق سے گریز کرنے والوں کو اس بارے میں عجیب عجیب قسم کے مفروضے ایجاد کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ طفیل احمد منگلوری نے لکھا:

''رسالہ اسباب بغاوتِ ہند کمپنی کی صد سالہ حکومت کی ایک صحیح اور مکمل تصویر ہے اور سیاست پر ایک ہندوستانی کا سب سے پہلا رسالہ ہے جو توپ کے منہ کے سامنے ایک ملازم سرکار نے لکھا۔'' [۴۵]

عتیق صدیقی اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''اسباب بغاوتِ ہند کی تالیف کے محرکات کو اگر وسیع تر تحقیق کا موضوع بنایا جائے تو یہ بیان مبالغے پر مبنی نظر آئے گا کہ اس کتاب کو توپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر ایک ملازم سرکار نے لکھا تھا۔'' [۴۶]

کیا ہم کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ سرسید کے علاوہ کسی اور ملازم سرکار نے اس موضوع پر جرأت مندانہ طور پر لکھنے کی ہمت کی ہو؟ عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''سرسید نے جب اسباب بغاوت لکھی، اس زمانے میں ایک اور ملازم سرکار صوبیدار سیتارام بھی کم و بیش اسی موضوع پر اپنے تجربات ''سپاہی سے صوبیدار'' کے نام سے مرتب کر رہا تھا اور دونوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے ایک ہی وقت میں لندن سے شائع ہوئے۔ سرسید کی کتاب کا ترجمہ سر آک لینڈ کالون اور کرنل گراہم نے کیا تھا اور سیتا رام کی کتاب کا ترجمہ کرنل نارگیٹ نے۔ صوبیدار سیتارام نے یہ کتاب کرنل نارگیٹ ہی کی تحریک پر لکھی تھی۔ اس کے آخری دو باب ''دیوانگی کی وبا'' اور ''پنشن'' اسباب بغاوتِ ہند کے موضوع سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے سیتارام ڈر رہا تھا کہ اس کے قلم سے کہیں ایسی باتیں نہ نکل جائیں جو سرکار کو ناگوار ہوں۔ کرنل نارگیٹ کا بیان ہے

کہ ''بڑی مشکلوں اور بڑی یقین دہانیوں کے بعد صوبیدار سیتارام نے اپنی یادداشتیں ذہن سے صفحۂ کاغذ پر منتقل کیں۔'' [۴۷]

بات جاری رکھتے ہوئے عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''سرسید نے کمپنی بہادر کے عہد کی جن ناانصافیوں اور بدعنوانیوں کا ذکر کیا تھا، سیتارام نے بھی ان سب کو ایک ایک کر کے گنایا تھا اور زیادہ شدومد سے گنایا تھا ...... سیتارام نے کمپنی کی جانشین ملکہ کی حکومت کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جو سرسید کے اور خود سیتارام کے بھی موضوع سے بڑی حد تک خارج تھا۔ اس سلسلے میں سیتارام نے یہ بڑی دلچسپ بات لکھی تھی کہ:

''ہمارے پنڈتوں نے یہ تو بتایا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت ختم ہو جائے گی کیونکہ پہلی بڑی لڑائی (پلاسی کی جنگ) کو اس وقت سو سال پورے ہو چکے ہوں گے، لیکن انہوں نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ اس کی جگہ پر ایک دوسری انگریزی حکومت قائم ہوگی جو اپنی پیش رو حکومت سے جابرتر اور دشوارتر ہوگی۔'' [۴۸]

سرسید اور سیتارام کی کتابیں انگریزوں کی نظر میں اپنے اندر کوئی زہریلا مواد نہیں رکھتی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو انگریز خود ان کے انگریزی میں تراجم کر کے شائع نہ کرتے۔ البتہ ایک عرصہ بعد اس موضوع پر ایک اَور کتاب شائع ہوئی جو یہاں تک خطرناک قرار پائی کہ انگلستان جیسے آزادئ رائے کا دعویٰ کرنے والے ملک میں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔ سرمحمد یامین خاں نے اپنے قیامِ انگلستان کے زمانے کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ساورکر نے اردو میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا انگریزی نام "India War of Independence of 1857" تھا اور اردو نام ''کوہِ آتش فشاں'' تھا۔ اس میں ...... انگریزوں کے مظالم بیان کیئے تھے۔ یہ کتاب انگلینڈ میں ممنوع تھی مگر فرانس میں چھپ کر اَور کتابوں کے ساتھ ملا کر لندن بھیجی جاتی تھی اور لڑکوں کو پڑھنے کو دی جاتی تھی۔ یہ ہدایت

ہوتی تھی کہ پڑھ کر دوسرے لڑکے کو دی جائے، اسی طرح میرے پاس بھی آئی تھی۔" [۴۹]

کہا جاتا ہے کہ سرسید نے بغاوت کا سارا الزام انگریز حکمرانوں پر ڈال دیا حالانکہ سارا نہیں بلکہ جتنا بھی ڈالا گیا، وہ خاص کمپنی کے انگریز حکمرانوں پر تھا، نہ کہ بحیثیت قوم انگریز حکمرانوں پر۔ جب ان کی حکمرانی جاتی رہی تو اب ایک لحاظ سے ان کے مقابل براہِ راست انگریز حکمرانوں کی قوم تھی۔ سیتارام نے وقت کے حکمرانوں کے خلاف لکھا مگر سرسید کو اس کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس کی بجائے انہوں نے حاکموں کا تعلق براہِ راست خدا سے جوڑا۔ ملاحظہ فرمائیے:

"خدا ہمیشہ ہماری ملکہ معظّمہ وکٹوریا کا حافظ ہے۔ خدا ہمیشہ ہمارے ناظم مملکتِ ہند نائب مناب ملکہ معظّمہ اور گورنر جنرل بہادر ہندوستان کا حافظ ہے۔" [۵۰]

"خدا ہمیشہ ہماری ملکہ معظّمہ وکٹوریا کا حافظ ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا خوبی اس پُر رحم اشتہار کی جو ہماری ملکہ معظّمہ نے جاری کیا۔ بے شک ہماری ملکہ معظّمہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے۔ بے شک یہ پُر رحم اشتہار الہام سے جاری ہوا ہے۔" [۵۱]

پس ہم نہایت یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب توپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر نہیں لکھی گئی بلکہ وقت کے حاکموں نے اپنے ملک میں عوامی رائے کو ہموار کرنے کے لئے سرسید کو حفاظتی حصار میں بٹھا کر اپنی نگرانی اور رہنمائی میں بڑے سکون کے ساتھ لکھوائی۔ دوسری طرف اگر سرسید نے "اسباب بغاوتِ ہند" میں کمپنی کے خلاف لکھا تو بھی انہیں داد دیجئے مگر یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے کن کن دلیلوں سے اپنی قوم کے افراد کی وکالت کی۔ چند مقامات کے اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

"دلّی کے بادشاہ معزول (بہادر شاہ ظفر) کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنّوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا...... دلّی کا معزول بادشاہ ہمیشہ یہ خیال کیا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اُڑ جاتا ہوں اور

لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے۔ ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہنے سے کوئی فرمان لکھ دیا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔'' ۵۲

''دلّی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا۔ اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں میں اس کی قدر اور منزلت گرا دی تھی ...... خاص دلّی کے اور اس کے قرب و جوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے۔'' ۵۳

''ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا...... اس زمانہ میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا، ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خواری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے اور کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جاسکتے تھے! اس ہنگامہ میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب، جو امانت تھا، اس میں خیانت کرنا، ملازمین کو نمک حرامی کرنی مذہب کی رُو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل، علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کا، مذہب کے بموجب گناہِ عظیم تھا، پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہوسکتا تھا! ہاں، البتہ چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے کو اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد۔'' ۵۴

''جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلّی میں گئی تو کسی شخص نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہوسکتا ...... مگر جب بریلی کی فوج دلّی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا، جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے،

بلا شبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتوے نے، جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بد ذات آدمی تھا، جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دیا تھا، بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اسکے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔'' ۵۵

''میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے حاکموں پر جہاد کریں، اور جاہلوں اور مفسدوں کا غلغلہ ڈال دینا کہ جہاد ہے، جہاد ہے اور ایک نعرہ حیدری پکارتے پھرنا قابل اعتبار کے نہیں۔'' ۵۶

یہ ہے مسلمانوں کی حمایت کے پردے میں سرسید کی اخلاقیات کا ایک خاکہ: اس کے برعکس بعض ہندو انہیں مسلمانوں کا سچا حامی سمجھتے ہوئے اپنے معاملے میں متعصب سمجھتے رہے۔ راجہ جے کشن داس سی۔ ایس۔ آئی نے کہیں رسائل ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے بعض فقروں سے یہ تاثر قائم کرلیا۔ الطاف حسین حالی نے اس بارے میں ان کا یہ بیان درج کیا ہے:

''جب سرسید نے رسالہ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ہے۔ اس وقت میرا مصمم ارادہ ہوگیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ انہی دنوں میرا مرادآباد جانا ہوا...... وہاں سرسید سے مدبھیڑ ہوگئی۔ میں نے ان فقروں کا ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔'' ۵۷

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کی حمایت میں کہی گئی کسی تحریر کے بارے میں اپنے قلم کی لغزش کا اقرار کیا کیونکہ ان کا یہ قلم ان رسائل میں بھی حریت پسند مسلمانوں کو کافر، بے ایمان اور بدذات وغیرہ قرار دیتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''سرکشی ضلع بجنور'' ہو، یا

''اسباب بغاوتِ ہند'' یا ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے رسائل، انہوں نے ہر جگہ اپنی دشنام دہی کا عمل صرف اور صرف مسلمانوں پر کیا ہے۔ سید محمد میاں لکھتے ہیں:

''سچائی اور خلوص کے ساتھ (مجاہدین اور سرسید کے نقطۂ نظر میں) اختلاف رائے باعثِ ملامت تو کیا ہوتا نصِ حدیث نے اس کو رحمت فرمایا ہے، البتہ یہ انتہا پسندی کہ مخالف کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر کر تہذیب و شائستگی کے لازمی تقاضوں سے بھی اس کو محروم کر دیا جائے اور اس کے لئے بازاری الفاظ سے بھی گئے گزرے الفاظ استعمال کئے جائیں، یقیناً ایسی شکایت ہے جس کا ازالہ آج تک نہیں ہوسکا۔'' ۵۸

سرسید کی ہمت و جرأت کے بڑے چرچے سننے میں آتے ہیں کہ انہوں نے اسبابِ بغاوت میں حکمرانوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ ذیل کی عبارت میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے گورنمنٹ کے کسی انتظام کو واقعی ''قابلِ اعتراض'' ٹھہرایا ہے مگر اس جرأت کے پسِ پشت یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ اس سے کس کی فلاح مقصود ہے؟ ملاحظہ فرمائیے:

''ہماری گورنمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابلِ اعتراض کے تھا۔ فوج انگلشیہ کی کمی ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی جبکہ نادر شاہ نے خراسان پر فتح پائی اور ایران اور افغانستان دو مختلف ملک اس کے قبضہ میں آئے، اس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں، ایک ایرانی قزلباشی، دوسری افغانی۔ جب ایرانی فوج کچھ عدول حکمی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج اس کے دبانے کو موجود تھی، اور جب افغانی فوج سرتابی کرتی تو قزلباشی اس کے تدارک کو موجود ہوتی۔ ہماری گورنمنٹ نے یہ کام ہندوستان میں نہیں کیا...... '' ۵۹

''یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو، جو آپس میں مخالف ہیں، نوکر رکھا تھا مگر بسبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں، ان میں بسبب ایک جا رہنے کے اور ایک لڑی میں مرتب ہونے کے آپس

میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہوتا جاتا تھا۔ ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں۔ اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے، سب اس میں شریک ہو جاتے تھے، ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہوتا جاتا تھا۔ اگر انہی دونوں قوموں کی پلٹن اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی اور وہی تفرقہ قائم رہتا......'' ۶۰ے

انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے کہ یہ گورنمنٹ پر نکتہ چینی ہے یا اسے ملک پر سدا قابض رہنے کا ایک بہترین منصوبہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے؟

ہمارے قلم کار ''اسباب بغاوتِ ہند'' کی شان بڑھانے کے لئے قارئین کو ایک تصوراتی کیفیت میں مبتلا کرتے ہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کی ہمدردی میں ان پر بغاوت کے الزام کی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی تاکہ انہیں انگریزوں کے عتاب سے بچایا جاسکے۔ عجیب فلسفہ ہے کہ وہ قوم، جس کی دانائی کی یہ ضرب المثل صدیوں سے زبان زدِ عوام و خواص ہے کہ وہ جو بھی کام کرتی ہے بڑے سوچ بچار کے بعد سالہا سال قبل اس کا منصوبہ بناتی ہے، وہ جو اسی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ایک منصوبے کے تحت تاجروں کے بھیس میں ہندوستان میں داخل ہوئی اور ایک طویل مدت تک اس ملک کے دانشوروں کی ذہانت کو ماؤف کرتے رہنے کے عمل کے ساتھ اس ملک پر آہستہ آہستہ قابض ہوتی گئی، اسے مسلمانوں کے متعلق یہ ''بدگمانی'' ہوگئی کہ انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ پھر اس سے بڑھ کر حیرانگی کی بات یہ کہ ہماری قوم میں جو صرف ایک عقل والا تھا، اس نے ہم سے ہزار گنا دانا قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں نے ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا اور یہ کہ حکمران انہیں اپنا مخالف سمجھنے میں صریحاً غلطی پر ہیں۔ کون اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ انگریز ہماری رگ رگ سے واقف تھے؟ ان کی حکمرانی کے ڈھنگ کا تو یہ عالم تھا کہ ہندوستانی علاقوں کے نظم ونسق کے لئے

جب انگریز افسر برطانیہ میں بھرتی کیے جاتے تھے تو انہیں یہاں کی تمام اقوام کے افراد کے عادات واطوار کی جزئیات تک کے مشاہدات کی تربیت دے کر روانہ کیا جاتا تھا۔ لگتا یوں ہے کہ ہمارے قلمکار اپنے جوازات سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انگریز بیوقوف تھے جو سرسید سے دانائی کی باتیں سیکھ رہے تھے یا پھر یہ دانشور اپنے قلم کی شعبدہ بازیوں سے اپنی قوم کو بیوقوف بنانا چاہتے ہیں؟ کیا آج ڈیڑھ سو سال بعد بھی دُنیا کا کوئی دانشور اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ مسلمانوں نے مبینہ ''غدر'' میں بھر پور حصہ نہیں لیا تھا؟ اس میں مسلمانوں کی شرکت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ دہلی کا مغل دربار اس کا مرکز بنا اور اس مرکز کے تمام روحِ رواں مسلمان تھے۔

سوچنے کا مقام ہے کہ جب ''اسبابِ بغاوت'' ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تو اس وقت امن وامان اور معافی کا اعلان جاری ہو چکا تھا، لہٰذا یہ کتاب اس وقت مسلمانوں کے حق میں کر بھی کیا سکتی تھی؟ جو کچھ ہونا تھا، اس سے قبل ہو چکا تھا۔ بے شمار مسلمان بغیر کسی مقدمے کے گولیوں سے بھونے جا چکے تھے یا سرسری مقدمات کے بعد پھانسیاں پا چکے تھے یا پھر قید و بند کی صعوبتیں بھگت رہے تھا۔ کالے پانی کی سزاؤں پر عملدرآمد ہو چکا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد عدالتوں میں جو مقدمات چل رہے تھے، انگریزوں نے ان کے معاملے میں سرسید کی تحریر سے متاثر ہو کر استغاثہ کو کوئی نرم ہدایات جاری نہیں کیں اور نہ ہی اس کے باعث کسی کی سزا منسوخ ہوئی یا اس میں تخفیف ہوئی۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کا معاملہ لیجئے۔ وہ سرسید کی نظر میں نہایت قابلِ احترام شخصیت تھے اور ان کے بارے میں وہ اپنی تصنیف ''آثار الصنادید'' میں بے پناہ عقیدت کا اظہار کر چکے تھے۔ انہیں کالے پانی کی سزا ہوئی، جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا، ایک اپیل اوپر سے ہوتی ہوئی ذاتی رائے کے حصول کے لئے ۱۸۶۱ء میں چیف کمشنر اودھ کے پاس آئی[۶۱] مگر سرسید کی کتاب اپنی اشاعت کے دو سال بعد بھی ان کی محبوب شخصیت کے کام نہ آسکی۔ کس کے کام آئی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

آخر میں ایک نکتہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سرسید نے جب ''سرکشی ضلع بجنور'' لکھی تو اس کے ''ابتدائیہ'' میں اس کے متن کی صداقت ان الفاظ میں بیان کی:

''اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے، بہت سا اس میں میری آنکھ کا دیکھا ہے اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا، اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے، وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت سچ لکھا ہے۔'' [۶۲]

اس تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے یہ کتاب کسی خارجی تحریک کے بغیر لکھی۔ تقریباً ڈیڑھ صد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں وقت کے حکام یا دوسرے الفاظ میں کمپنی کے اربابِ اختیار کی شان میں قصیدہ گوئی اپنے عروج پر ہے اور مؤلف کو سرکاری حکمتِ عملی میں کوئی نقص نظر نہیں آیا۔ ''خاتمہ'' کی تحریر میں سرسید نے بجنور کے باشندوں سے مخاطب ہوتے ہوئے سابقہ حکمران بادشاہوں اور انگریزی دورِ حکومت کا موازنہ جس انداز میں بیان کیا ہے، اس کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

''......اگلے بڑے بڑے بادشاہوں کی عملداریوں کا حال تاریخ کی کتابوں سے دیکھو کہ ان منتظم عملداریوں میں کیا کیا ظلم اور کیا کیا آفتیں رعایا پر رہتی تھیں۔ یہ آرام جو سرکارِ دولت مدار انگلشیہ کی عملداری میں ہے، اس کا لاکھواں حصہ بھی نصیب نہ تھا۔ دیکھو، سرکارِ انگلشیہ کی عملداری میں ہندو مسلمان سب امن سے اور آسائش سے رہتے ہیں۔ کوئی زبردست زیردست پر ظلم نہیں کر سکتا......سوداگر اپنے تجارت کے کام میں مشغول ہیں، لاکھوں روپیہ کا مال ایک بڈھے ضعیف گماشتہ کے ساتھ کر کے ہزاروں کوس بھیجتے ہیں اور نفع اٹھاتے ہیں۔ کسی ڈاکو ٹھگ کا اندیشہ نہیں رہا۔ رستہ کیسے صاف ہیں کہ رات کو عورتیں ہزاروں روپیہ کا زیور پہنے ہوئے گاڑی میں بیٹھ منزلوں چلی جاتی ہیں اور کچھ کھٹکہ نہیں ہوتا۔ زمیندار کاشتکار اپنی کھیتی کے کام میں مشغول ہیں۔ جو روپیہ مالگذاری کا ان سے ٹھہر گیا، اس سے زیادہ ایک حبہ بھی کوئی نہیں لیتا۔ غرض کہ یہ انصاف اور یہ آسائش اور یہ آزادی اور یہ عدم مزاحمت ہر کسی کے حال اور قال اور مذہب اور ملت سے، جیسا کہ ہماری سرکار انگلشیہ کے عہد میں ہے، کسی کے عہد میں نہیں ہوا۔ تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کا شکر ادا نہیں کیا، اس کا وبال تم پر پڑا اور چند روز تغیر عملداری کر کے تم کو مزا چکھا دیا۔ حکمتِ الٰہی اس میں یہ تھی کہ اب تم ہماری

سرکارِ انگلشیہ کی عملداری کی قدر جانو اور اس کے سایۂ حمایت کو اپنے سر پر ظلِ ہما سے بہتر سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتے رہو۔''

''.......اس عملداری میں رعایا اور حکام سب شریک ہیں۔اس قسم کی عملداری کا حق ایک رعایا پر ہوتا ہے جس کا ادا کرنا ہر ایک رعیت پر واجب ہے، اور وہ حق یہ ہے کہ ایسی عملداری کی رعایا کو طرفداری اپنی گورنمنٹ کی واجب اور لازم ہوتی ہے اور نہ کرنے کی صورت میں مجرم اور قصوروار ہوتا ہے۔ پس اس نازک وقت میں سب ہندوستان کی رعایا کو واجب تھا کہ سرکارِ انگلشیہ کی طرفداری کرتی اور جو حق عملداری سرکار کا ان کے ذمہ تھا، اس کو ادا کرتے ......تم لوگ اس سے غافل رہے بلکہ اس کے برعکس کیا اور تمام اپنے ہموطنوں کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ اے کاش! اگر تم ایسا کرتے تو یہ روزِ بد جو تم کو بسزائے تمہارے اعمال کے نصیب ہوا ہے، کیوں ہوتا؟ اب بھی تم کو چاہیے کہ حقِ گورنمنٹ ادا کرو اور جوڑ وسیا ہی تم کو گورنمنٹ سے حاصل ہوئی ہے، اس کو آبِ زلالِ اطاعت اور فرمانبرداری اور دلی طرفداری گورنمنٹ سے دھوؤ تا کہ نتیجہ نیک پاؤ۔'' [۶۳]

اب غور فرمائیے کہ ''سرکشی ضلع بجنور'' کی تالیف کی اشاعت تک تو انگریزوں کا دورِ حکومت رعایا کے لئے شروع سے لے کر آخر تک ''سب اچھا'' رہا مگر چند ہی مہینوں بعد لکھی جانے والی ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے وقت کیا مجبوری پیش آ گئی کہ ''بہت صحیح اور نہایت سچ''، لکھی ہوئی تحریر میں اسی دورِ حکومت کے نقائص کی نشاندہی کرنا پڑی؟ سوچنے کا مقام ہے کہ یہ کیفیت کس امر کی چغلی کھاتی ہے۔اگر اسبابِ بغاوت اپنے مزاج کے مطابق لکھی گئی ہوتی تو اس میں بھی ''کمپنی بہادر'' کے لئے حسبِ سابق ''سب اچھا'' کی گردان ہوتی۔

اتفاقات ہیں زمانے کے کہ سرسید نے اپنی شاعری کے زمانے میں ایک مثنوی لکھی تھی جس کا یہ ایک مصرع انہی کا سنایا ہوا شبلی نعمانی کو یاد رہا:

نام میرا تھا، کام اُن کا تھا [۶۴]

اور یہی اس مضمون کا ماحصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مجموعہ لکچرز واسپیچز نواب محسن الملک۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص۳۱۶

۲۔ حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ اول، ص۹۱

۳۔ ایضاً، جلد دوم، ص۳۶

۴۔ اسبابِ سرکشی ہندوستان (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء) ص۱

۵۔ حیاتِ جاوید، جلد اول، ص۹۰

۶۔ سرسید احمد خاں: ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)، ص۲۹ تا ۳۱

۷۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں/مرتبہ شرافت حسین مرزا) ندوۃ المصنفین دہلی (۱۹۶۴ء)، ص۷۵

۸۔ ایضاً، ص۸۱

۹۔ ایضاً، ص۷۹

۱۰۔ علماءِ ہند کا شاندار ماضی (سید محمد میاں) الجمعیۃ پریس دہلی (۱۹۶۰ء) جلد چہارم، ص۴۴۳

۱۱۔ سرسید احمد خاں: ایک سیاسی مطالعہ، ص۳۹

۱۲۔ انقلاب ۱۸۵۷ء (پی۔ سی۔ جوشی) ترقی اردو بیورو نئی دہلی (۱۹۸۳ء) ص۲۹۹

۱۳۔ ایضاً، ص۳۰۲

۱۴۔ ایضاً، ص۳۰۳

۱۵۔ ایضاً، ص۳۰۹

۱۶۔ ایضاً، ص۳۱۰۔۳۱۱

۱۷۔ ایضاً، ص۳۱۶

۱۸۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل (سید طفیل احمد منگلوری) نظامی پریس بدایوں (۱۹۴۰ء) ص۲۴۹۔۲۵۱

۱۹۔ ایضاً، ص۲۵۲۔۲۵۳

۲۰۔ ایضاً، ص۲۵۳۔۲۵۵

۲۱۔ المیہ تاریخ (ڈاکٹر مبارک علی) پروگریسو پبلشرز لاہور (۱۹۹۳ء) ص۱۷۲۔۱۷۳

۲۲۔ مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز سرسید (مرتبہ: امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص۵۱۲

۲۳۔ مجموعہ لکچرز واسپیچز نواب محسن الملک، ص۳۱۶

۲۴۔ حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص۹۰

۲۵۔ سیرتِ فریدیہ (سرسید احمد خاں/مرتبہ محمود احمد برکاتی) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۶۴ء) ص۴۵

۲۶۔ مقالات قومی سرسید سیمنار (مرتبہ: ریاض الرحمٰن شروانی) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ (۲۰۰۰ء) ص ۶۸

۲۷۔ سرسید احمد خاں: حالات وافکار (عبدالحق) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۵ء) ص ۲۰

۲۸۔ تہذیب الاخلاق، لاہور (نومبر ۱۹۹۲ء) ص ۴۱

۲۹۔ تفسیر القرآن سرسید (تعارف کنندہ: رفیع اللہ شہاب) دوست ایسوسی ایٹس لاہور (۱۹۹۴ء) تعارف صفحہ دوم

۳۰۔ حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص ۸۹

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ Records of the Intelligence Department, Vol.II
(Sir William Muir) T.&T.Clark, Edinburgh (1902) p.361

۳۳۔ حیاتِ جاوید، حصہ اول، ۹۰

۳۴۔ لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص ۱۳

۳۵۔ حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص ۶۹

۳۶۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۱۳

۳۷۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) جلد اول، ص ۱۴۔۱۵

۳۸۔ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸ء)، ص ۱۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۳۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۶۱

۴۱۔ ایضاً، ص ۹۸

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔۱۰۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۴۵ / لائل محمڈنز آف انڈیا، جلد اول، ص ۱۷

۴۴۔ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸ء)، ص ۶۷۔۶۸

۴۵۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۸۳

۴۶۔ سرسید احمد خاں: ایک سیاسی مطالعہ، ص ۴۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۰

۴۸۔ ایضاً، بحوالہ
From Sepoy to Subedar (Sita Ram), Lahore (1873) p.165

۴۹۔ نامۂ اعمال (سر محمد یامین خاں) آئینہ ادب لاہور (۱۹۷۰ء) حصہ اول، ص ۲۷

۵۰۔ اسباب سرکشی ہندوستان، ص ۳۸

۵۱۔ ایضاً،ص۴۱
۵۲۔ ایضاً،ص۴
۵۳۔ ایضاً،ص۶
۵۴۔ ایضاً،ص۶۔۷
۵۵۔ ایضاً،۷
۵۶۔ ایضاً،ص۸
۵۷۔ حیاتِ جاوید،حصہ اول،ص۱۰۴
۵۸۔ علماء ہند کا شاندار ماضی،جلد چہارم،ص۳۴۴
۵۹۔ اسباب سرکشی ہندوستان،ص۴۲
۶۰۔ ایضاً،ص۴۲۔۴۳
۶۱۔ علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور جہادِ آزادی (محمد سعید الرحمٰن علوی) سنی پبلیکیشنز لاہور (۱۹۸۷ء)،ص۲۶۳
۶۲۔ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸ء)،ص۱
۶۳۔ ایضاً،ص۱۴۳۔۱۴۵
۶۴۔ انتخاب مضامینِ شبلی۔اردو اکیڈمی سندھ کراچی (۱۹۶۰ء)،ص۵۲

کتابیات

بلحاظ حروفِ تہجی

۱۔ ۱۸۵۷ء (غلام رسول مہر) کتاب منزل لاہور (۱۹۶۰ء)

۲۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد (غلام رسول مہر) کتاب منزل لاہور (۱۹۶۰ء)

۳۔ اردو صحافت (مرتبہ: انور علی دہلوی) اردو اکادمی دہلی (۱۹۸۷ء) ص ۸۸۔۸۹

۴۔ اسبابِ سرکشی ہندوستان (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء)

۵۔ المیہ تاریخ (ڈاکٹر مبارک علی) پروگریسو پبلشرز لاہور (۱۹۹۳ء)

۶۔ امتیازِ حق (راجا غلام محمد) مکتبہ قادریہ لاہور (۱۹۷۹ء)

۷۔ انتخاب مضامینِ شبلی۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی (۱۹۶۰ء)

۸۔ انقلاب ۱۸۵۷ء (پی۔ سی۔ جوشی) ترقی اردو بیورو نئی دہلی (۱۹۸۳ء)

۹۔ انگریز کے باغی مسلمان (جانباز مرزا) مکتبہ تبصرہ لاہور (۱۹۹۰ء)

۱۰۔ بہادر شاہ ظفر (اسلم پرویز) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی (۱۹۸۶ء)

۱۱۔ تاریخ بغاوتِ ہند/محاربۂ عظیم (پنڈت کنہیا لال) مطبع منشی نول کشور لکھنؤ (۱۹۱۶ء)

۱۲۔ تحقیقاتِ چشتی (نور احمد چشتی) پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور (۱۹۶۴ء)

۱۳۔ تفسیر القرآن سرسید (تعارف کنندہ: رفیع اللہ شہاب) دوست ایسوسی ایٹس لاہور (۱۹۹۴ء)

۱۴۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (محمد ایوب قادری) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء)

۱۵۔ حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء)

۱۶۔ خطبات گارساں دتاسی (حصہ اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۹ء)

۱۷۔ خطوط بنام سرسید (شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۹۵ء)

۱۸۔ داستانِ غدر (ظہیر دہلوی) اکادمی پنجاب لاہور (۱۹۵۵ء)

۱۹۔ دِلّی کی سزا (غلام حسین خاں) دلّی پرنٹنگ پریس دہلی (۱۹۴۶ء)

۲۰۔ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر (سرسید احمد خاں) ہنری ایس کنگ لندن (۱۸۷۲ء)

۲۱۔ سرسید احمد خاں: ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

۲۲۔ سرسید احمد خاں: حالات وافکار (عبدالحق) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۵ء)

۲۳۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء)

۲۴۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں/مرتبہ شرافت حسین مرزا) ندوۃ المصنفین دہلی (۱۹۶۴ء)

۲۵۔ سفر نامہ پنجاب (مرتبہ: سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء)

۲۶۔ سیرتِ فریدیہ (سرسید احمد خاں) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۶ء)

۲۷۔ سیرتِ فریدیہ (سرسید احمد خاں/مرتبہ محمود احمد برکاتی) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۶۴ء)

۲۸۔ علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور جہادِ آزادی (محمد سعید الرحمٰن علوی) سنی پبلیکیشنز لاہور (۱۹۸۷ء)

۲۹۔ علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم (سید محمد میاں) الجمعیۃ پریس دہلی (۱۹۶۰ء)

۳۰۔ غالب اور سن ستاون (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی (۱۹۸۸ء)

۳۱۔ غداروں کے خطوط (سلیم قریشی رسید عاشور کاظمی) انجمن ترقی اردو دہلی (۱۹۹۳ء)

۳۲۔ غدر کی صبح شام (جیون لال کی ڈائری)، ہمدرد پریس دہلی (۱۹۲۶ء)

۳۳۔ غدر کے فرمان (مرتبہ: خواجہ حسن نظامی) اہلِ بیت پریس دہلی (۱۹۴۴ء)

۳۴۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ، جلد اول (۱۸۶۰ء)

۔ ایضاً ۔ جلد دوم (۱۸۶۰ء)

۔ ایضاً ۔ جلد سوم (۱۸۶۱ء)

۳۵۔ محاصرہ دہلی کے خطوط، مطبوعہ دہلی (۱۹۴۰ء)

۳۶۔ مجموعہ لکچرز واسپیچز نواب محسن الملک ۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء)

۳۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل (سید طفیل احمد منگلوری) نظامی پریس بدایوں (۱۹۴۰ء)

۳۸۔ مضحکات ومطائباتِ سرسید (مرتبہ: شیر علی خاں سرخوش) گیلانی برقی پریس لاہور (ب۔ت)

۳۹۔ مقالات قومی سرسید سیمنار (مرتبہ: ریاض الرحمٰن شروانی) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ (۲۰۰۰ء)

۴۰۔ مقالات گارساں دتاسی (جلد اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۴ء)

۴۱۔ مقدمہ بہادر شاہ ظفر (مرتبہ خواجہ حسن نظامی) الفیصل لاہور (۱۹۹۰ء)

۴۲۔ مکتوباتِ سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد اول، ص ۱۹۷۶ء)

۴۳۔ مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز سرسید (مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء)

۴۴۔ مولانا فضل حق خیرآبادی (مرتبہ: افضل حق قرشی) الفیصل لاہور (۱۹۹۲ء)

۴۵۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون (حکیم محمود احمد برکاتی) برکات اکیڈمی کراچی (۱۹۸۷ء)

۴۶۔ نامۂ اعمال (سر محمد یامین خاں) آئینۂ ادب لاہور، حصہ اول (۱۹۷۰ء)

۴۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان (ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر) اقبال اکیڈمی لاہور (۱۹۴۴ء)

علمی جرائد

۱۔ افکار، کراچی (خصوصی نمبر برطانیہ)
۲۔ تہذیب الاخلاق، لاہور (نومبر ۱۹۹۲ء)
۳۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ (۱۳ جنوری ۱۸۷۱ء)
۴۔ گُلِ خنداں، لاہور (انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر) ۱۹۵۷ء

دستاویزات

☆ انڈیا آفس ریکارڈز (لندن) فائل نمبر L/P&S/15/73

English Sources

1. Delhi in 1857 (N.K.Nigam),S.Chand & Co. Delhi.(1957)
2. Eye-witnesses to the Indian Mutiny (James Hewitt) Osprey Publishing Ltd., Berkshire. (1972)
3. From Sepoy to Subedar (Sita Ram), Lahore (1873)
4. Kotwal's Diary (Syed Mubarak Shah) Pakistan Historical Society, Karachi.(1994)
5. Records of the Intelligence Department (Sir William Muir) T. & T. Clark, Edinburgh. (1902) Vols. I & II.
6. Twelve Years of a Soldier's Life in India (George H.Hodson), John W.Parker, London, (1859)

بہادر شاہ ظفر کے شب و روز

☆ ''بہادر شاہ ظفر کے شب و روز'' ضیاء الدین لاہوری کی کتاب ہے جو کہ مصنف کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے متعلقہ طبع شدہ روز ناچوں اور اخبارات سے دستیاب شدہ معلومات پر مشتمل تصنیف ہے۔ انہیں بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ کے دربار اور اُس کے متعلق جو تفصیلات مہیا ہوئیں، ان سے ''بہادر شاہ ظفر کے شب و روز'' کی ایک نہایت قابلِ اعتماد تصویر سامنے آتی ہے...... کتاب عبرت کا ایک باب ہے، اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ **(الدعوۃ، لاہور۔فروری ۲۰۰۵ء)**

☆ جناب ضیاء الدین لاہوری...... کی تازہ ترین تصنیف ''بہادر شاہ کے شب و روز'' ہے۔ مصنف تاریخ سے انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے مقامی کتب خانے کھنگالے، لندن میں انڈیا آفس لائبریری، لندن یونیورسٹی کے اورینٹل سٹڈیز مرکز اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مصنف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے متعلق حقائق جاننے کے لئے نکلے تو اُس دَور کے روز ناچوں، اخبارات اور دیگر دستاویزات کے مطالعہ کا موقع ملا۔...... ایک بار اس کتاب کا مطالعہ شروع کر بیٹھیں تو ختم کئے بغیر سکون نہیں ملے گا۔ **(تعلیمی زاویے، لاہور۔اپریل ۲۰۰۰ء)**

☆ ضیاء الدین لاہوری تاریخی تحقیق کے حوالے سے ایک جانے پہچانے صاحبِ قلم ہیں...... وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بہادر شاہ ظفر کے شب و روز پر مشتمل ہے۔ یہ حالات اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ ہم انہیں چشمِ تصور سے فلم کی طرح دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں...... اس عہد پر یہ کتاب بے شمار کتابوں، روز ناچوں اور اس وقت کے اخبارات و جرائد میں پیش کی گئی معلومات کا نہایت عُمدہ نچوڑ ہے...... یہ کتاب سچ پوچھئے تو عبرت کا نشان ہے...... ہمارا خیال ہے کہ ضیاء الدین لاہوری نے یہ کتاب لکھی ہی عبرت حاصل کرنے کے لئے ہے۔ ایک اعتبار سے انہوں نے مغل اقتدار کے زوال کی کہانی بیان کر کے ہمیں جھنجوڑا ہے، خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے۔ ہم ہر پاکستانی سے کہیں گے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔ **(قومی ڈائجسٹ، لاہور۔دسمبر ۱۹۹۹ء)**

☆ مؤلف جناب ضیاء الدین لاہوری نے کتاب کی ترتیب و تدوین میں بڑی تحقیق و تفحص سے کام لیا ہے اور ایسا شستہ اور شگفتہ اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے کہ قاری اس کے اندر جذب ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے سامنے اس دَور کا نقشہ اس طرح کھنچ جاتا ہے گویا وہ ایک فلم دیکھ رہا ہو...... مغل سلطنت کے کھنڈر یا نام کے آخری مغل بادشاہ کے دور کا یہ غایت درجہ دلچسپ تذکرہ نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ عبرت کا درس بھی دیتا ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے مطالعہ کے لائق ہے اور کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہیں رہنا چاہیے۔ **(بیدار ڈائجسٹ، لاہور۔فروری ۲۰۰۳ء)**

☆ ایک تیر سے دو شکار کا محاورہ جن جگہوں پر لفظ ''دو'' میں ترمیم کا تقاضا کرتا ہے، اُن میں سے ایک ضیاء الدین لاہوری کی کتاب ''بہادر شاہ ظفر کے شب و روز'' کا مطالعہ ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کے ذریعے واقعی کئی شکار کئے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دورِ زوال کی داستان، شاہی دربار کی بے خبریاں اور انگریزی سرکار کی سازشیں، سلطنت مغلیہ کے آخری ایام میں موجود صحافت کا حال اور سب سے بڑھ کر عام تاریخی روایتوں اور ادبی داستانوں کی بجائے اخبارات، روز ناچوں؛ سرکاری دستاویزات اور چشمِ دید مناظر کو ضبط کر لینے والی غیر معروف کاوشوں کے ذریعے ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے جہاں قاری انیسویں صدی کے وسط کے مناظر کو چشمِ تخیل سے دیکھتا ہے اور کہیں حیرت، کہیں حسرت اور کہیں حقارت اس کے ردِ عمل کا نام پاتی ہے یہی نہیں، اس سے کہیں بڑھ کر کتاب ہمارے لئے معلومات افزا اور عبرت انگیز ہے۔ **(ایشیا، لاہور۔۱۴ اگست ۲۰۰۲ء)**

☆ یہ کتاب بہادر شاہ ظفر کے آخری سالوں کے بارے میں ہے۔ کتاب کا مواد اس عہد کے روز ناچوں، یادوں، ڈائریوں، اخبارات اور مکتوبات سے حاصل کیا گیا ہے...... یہ وہ منظر نامہ ہے جو ضیاء الدین لاہوری نے عینی شاہدوں اور اسی ڈرامے کے کرداروں کی زبانی بیان کر دیا ہے۔ ترتیب میں ضیاء الدین لاہوری کے سلیقے کا اظہار موجود ہے۔ بہر حال یہ کتاب بہادر شاہ کے آخری عہد پر ایک جامع اور مستند کتاب ہے۔ **(الفاروق، کراچی۔ذوالقعدہ ۱۴۲۴ھ)**